نومبر ۱۹۹۱ء

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

حرفِ اوّل	عاکف سعید	۲
مطالعۂ قرآن حکیم (سورۃ الانعام رکوع ۳)	ڈاکٹر اسرار احمد	۳
کاروانِ حدیث : ۱۹	عبدالرشید عراقی	۸
حکمتِ اقبال (۳۷)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم	۱۴
قرآن اور جدید سائنس (۲)	پرویز ہاشمی	۲۳
لغات و اعرابِ قرآن (۲۹)	پروفیسر حافظ احمد یار	۳۵
عکسِ اسرارِ خودی (منظوم)	ڈاکٹر عصمت جاوید	۵۱
قرآن کالج میں ریفریشر کورس (مختصر رپورٹ)	میاں ساجد حمید	۵۷
ڈاکٹر طاہر سعید کے نام (۱۵)	ڈاکٹر حافظ محمد مقصود	۵۹

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

صدرِ مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن اور امیرِ تنظیمِ اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کی علمی و فکری اور دعوتی و تحریکی کاوشوں کا نچوڑ

۲۸۰ صفحات پر مشتمل ایک اہم علمی دستاویز جس میں عملی خطوط کی نشاندہی بھی موجود ہے

دعوت رجوع اِلیَ القرآن

کا منظر و پس منظر

چھپ کر آگئی ہے — ضرور مطالعہ کیجئے — دُوسروں تک پہنچایئے

▪ سفید کاغذ ▪ عمدہ کتابت ▪ دیدہ زیب طباعت ▪ قیمت مجلد -/۶۵ روپے ▪ غیر مجلد -/۵۰ روپے

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

25-11-91

ماہنامہ

حکمت قرآن

لاہور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ۔ مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارۂ تحریر

پروفیسر حافظ احمد یار، حافظ خالد محمود خضر

جلد ۱۰ | نومبر ۱۹۹۱ء - جمادی الاولیٰ ۱۴۱۲ھ | شمارہ ۱۱

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶- کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴- فون: ۸۵۶۰۰۳

کراچی آفس: ۱ داؤد منزل متصل شاہ بخری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زر تعاون ۴۰/- روپے، فی شمارہ ۴/- روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

ہفتہ ۹ر نومبر ۹۱ء کو قرآن آڈیٹوریم اتاترک بلاک گارڈن ٹاؤن میں تقریبِ تکمیلِ درسِ قرآن مجید منعقد ہوئی ـــــ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، رجوع الی القرآن کی جس تحریک کی علمبردار ہے اس کے نقطۂ آغاز کی حیثیت بجا طور پر مرکزی انجمن کے صدر مؤسس جناب ڈاکٹر اسرار احمد کے درسِ قرآن کو حاصل ہے۔ احباب جانتے ہیں کہ شہر لاہور میں محترم ڈاکٹر صاحب کو درس قرآن دیتے ربع صدی سے زائد عرصہ ہو چکا ہے۔ گویا "یہ ربع صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں"۔ اوائل ۶۶ میں ساہیوال (سابقہ منٹگمری) سے لاہور منتقل ہونے کے فوراً بعد شہر کے مختلف علاقوں میں ہفتہ وار درس قرآن کی مجالس کا آغاز ہو گیا تھا۔ ہر ایسی جگہ پر جہاں نیا حلقہ درس قائم ہوتا محترم ڈاکٹر صاحب قرآن حکیم کے منتخب مقامات پر مشتمل معین ایک نصاب کا درس دیتے۔ (یہ منتخب مقامات یکجا طور پر کتابی شکل میں "منتخب نصاب" کے نام سے مدوّن موجود ہیں)۔ بالعموم ایک مقام پر منتخب نصاب کے دروس کی تکمیل کے بعد درس کا سلسلہ کسی دوسرے مقام پر منتقل ہو جاتا کہ تحریک رجوع الی القرآن کا تقاضا یہی تھا۔ تاہم مسجد خضریٰ سمن آباد کو چونکہ اس تحریک میں ایک مرکزی پوزیشن حاصل ہو گئی تھی کہ محترم ڈاکٹر صاحب یہاں ایک عرصے تک خطابت جمعہ کی ذمہ داری بھی نبھاتے رہے اور اتوار کی صبح (اُن دنوں ہفتہ وار تعطیل اتوار کے روز ہوتی تھی) درس قرآن کی مرکزی نشست اسی مسجد میں ہوتی تھی لہٰذا یہاں منتخب نصاب کے دروس کے مکمل ہونے پر سورۃ الفاتحہ سے سلسلہ وار درس قرآن کا آغاز کر دیا گیا۔ یہ بات جون ۱۹۶۸ء کی ہے۔ خود محترم ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب "دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" میں اس سلسلہ وار درس قرآن کی تاریخ یوں بیان فرمائی ہے:

> "مسجد خضریٰ میں راقم نے آغاز میں منتخب نصاب کا درس دیا تھا' اس کی تکمیل پر شروع سے مسلسل درس قرآن شروع ہوا۔ پھر اک بار کسی سبب سے قدرے وقفہ ہوا تو دوبارہ پھر ایک بار منتخب نصاب کا اعادہ کیا ـــــ اور اس کے بعد مسلسل درس جاری کیا ـــــ پھر مسجد شہداء میں بھی اولاً منتخب نصاب ہی بیان ہوا' اس کے بعد وہاں بھی (۱۹۷۴ء میں) آغاز سے مسلسل درس شروع کر دیا۔ اس طرح ایک زمانے میں لاہور

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃ الانعام

رکوع ۳

(ایک تقریر جو ۲۳ اپریل ۱۹۷۶ء کی شام کو ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر کی گئی)

سورۃ الانعام قرآنِ حکیم کی طویل ترین مکّی سورتوں میں سے ہے اور داخلی و خارجی دونوں قسم کے قرائن و شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۂ مبارکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر آپؐ کے قیامِ مکّہ کے بالکل آخری دَور میں پُوری کی پُوری یکبارگی نازل ہوئی۔

یہی وجہ ہے کہ اس میں ایک جانب تو فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ زورِ استدلال اور جوشِ خطابت دونوں اپنے عُروج پر ہیں اور دوسری جانب وہ بحث و تمحیص اور ردّ و قدح بھی پُوری شدّت کو پہنچی نظر آتی ہے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے ردِّ عمل کے طور پر مکّہ میں پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ یہ سورت از اوّل تا آخر مشرکین، منکرینِ آخرت اور مکذّبینِ نبوّت و رسالت کے ساتھ ایک مسلسل مناظرے و مجادلے پر مشتمل ہے۔

ظاہر ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے بنیادی نکات تین تھے:

ایک[۱]: اللہ تعالےٰ کی کامل اور بے لاگ توحید کا اقرار و اعلان اور شرک کی ہر صورت کا پُر زور ابطال خواہ وہ کسی کو کسی اعتبار سے اللہ تعالےٰ کا ہم جنس اور ہم کفو قرار دینے کی صورت میں ہو، خواہ اس کی کسی صفت میں اُس کا ہمسر یا ہم پلّہ بنا دینے کی صورت میں ہو، یا کسی کو کسی پہلو سے اس کے حقوق و اختیارات میں اُس کا ساجھی یا مدِّ مقابل یا ضدّ و ندّ ٹھہرانے کی صورت میں ہو۔

دوسرے[۲] ایمان بالمعاد ـــــ یعنی بعث بعد الموت، حشر و نشر، حساب کتاب، جزا و سزا اور جنّت و دوزخ کی حقّانیّت کا اقرار و یقین ـــــ اور

تیسرے[۳] ایمان بالرّسالت ـــــ یعنی انزالِ وحی و کتب اور بعثتِ انبیاء و رُسُل کا اقرار، تمام

انبیاء و رُسل کی تصدیق اور بالخصوص آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت و رسالت کا اقرار و یقین۔

قرآنِ حکیم کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ کتابِ الٰہی کی مکّی سورتوں میں انہی تین اساسی امُور کا اثبات اور ان پر وارد کیے جانے والے اعتراضات کا پُرزور ابطال تانے بانے کے مانند بُنا ہوا ہے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ ع "اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں!" کے مصداق کہیں ان کا کوئی ایک پہلو زیرِ بحث آگیا ہے کہیں دوسرا، اور کہیں کوئی اسلوب اختیار کیا گیا ہے کہیں کوئی! کہیں زیادہ زور (EMPHASIS) ایمان باللہ یا توحید پر ہے کہیں ایمان بالآخرت یا معاد پر، اور کہیں بحث اِدھر سے اُدھر کو چلتی ہے کہیں اُدھر سے اِدھر کو! ——— سورۃ الانعام میں یہ کیفیت اس حد تک نمایاں ہے کہ اس کے ہر رکوع میں ان تینوں مضامین کا تانا بانا صاف پہچانا جا سکتا ہے۔ مثلاً اس کے تیسرے رکوع ہی کو لیجیے ——— اس میں کل دس[۱] آیات ہیں جن میں سے پہلی چار آیات ردِّ شرک پر مشتمل ہیں، درمیانی دو[۲] ردِّ منکرینِ نبوّتِ محمدیؐ پر اور آخری چار ردِّ منکرینِ آخرت پر۔ ارشاد ہوتا ہے:

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم   بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۚ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ ۲۱

"اور اُس سے بڑھ کر ظالم اور ناانصاف کون ہوگا جو اللہ پر بہتان تراشے یا اُس کی نشانیوں کو جھٹلائے حقیقت یہ ہے کہ ایسے ظالم کبھی فلاح سے ہمکنار نہ ہو سکیں گے۔"

گویا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی بھی حیثیت سے کسی کو شریک کرنا دوہرا جُرم ہے ——— اس لیے کہ ایک طرف تو یہ اللہ تعالیٰ پر صریح افترا اور بہتان تراشی ہے اور دوسری طرف ان تمام آفاقی، انفسی اور تنزیلی آیات کی تکذیب ہے جو گویا پکار پکار کر توحیدِ خالص کی شہادت دے رہی ہیں۔

آگے فرمایا:

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝ ۲۲ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ۝ ۲۳ اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ ۲۴

"اور یاد کرو وہ دن جب ہم جمع کریں گے ان سب کو' پھر پوچھیں گے مشرکوں سے کہاں ہیں تمہارے وہ شرکاء جنہیں تم نے ہمارا ساجھی سمجھا تھا۔ اُس وقت ان کی ساری فتنہ پردازی دھری رہ جائے گی اور ان کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ رہ جائے گا کہ قسم کھا کر کہیں ہمیں اللہ ربّ العزّت کی قسم ہے ہم ہرگز مشرک نہ تھے۔ دیکھا تم نے کیسا جھوٹ تراشا انہوں نے اپنے آپ پر اور ہوا ہوگیا اُن کا سارا افترا۔"

ان آیات میں کھُلے کھُلے مشرکین کے کھسیانے پن کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ تو واضح ہے ہی' ان برخود غلط لوگوں کے فریب کا پردہ بھی چاک کر دیا گیا ہے جو دعویٰ تو توحید کا کرتے ہیں لیکن ؎

"ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے"

کے مصداق شرک سے بالکلیہ بری ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں اور "وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُونَ ۝" کی کامل تصویر بنے ہوئے ہیں۔ اِس کی نمایاں ترین مثال تو عیسائیوں کا عقیدۂ تثلیث ہے کہ اس دنیا میں بھی جب اُن کے شرک کا پردہ دلائل سے چاک کر دیا جاتا ہے تو اُن کے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہ جاتا کہ اپنی تثلیث کو بھی توحید ہی کا رنگ دیں اور ایک میں تین اور تین میں ایک کے لاینحل معمّے کے دامن میں پناہ لیں ——— ویسے اس کی بہت سی دوسری مثالیں بھی ہمارے گرد و پیش موجود ہیں' فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ!

حاصلِ کلام یہ کہ اِن مشرکین کے حصّے میں تمام تر جھوٹ اور افترا ہی آیا ہے۔ اس دنیا میں یہ خدا پر افترا کرتے ہیں' آخرت میں خود اپنے آپ پر جھوٹ تراشیں گے!

اس کے بعد کی دو آیات میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مخالفین و معاندین کی حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ إِلَيْكَ ج وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ أٰذَانِهِمْ وَقْرًا ط وَإِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ط حَتّٰٓى إِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا إِنْ هٰذَآ إِلَّآ أَسَاطِيْرُ الْأَوَّلِيْنَ ۝ ۲۵ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْئَوْنَ عَنْهُ ج وَإِنْ يُّهْلِكُوْنَ

اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ ۝ ۲۶

"اور ان میں سے کچھ وہ لوگ بھی ہیں جو (اے نبیؐ) آپ کی بات (بظاہر) کان لگا کر سنتے ہیں لیکن ہم نے (ان کے اعراض وانکار' بغض وعناد اور تعصب اور ہٹ دھرمی کے باعث) ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں تاکہ وہ سمجھ نہ سکیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی ہے۔ (تاکہ سن نہ سکیں) چنانچہ اب وہ خواہ تمام نشانیاں دیکھ لیں' ہرگز ایمان نہ لائیں گے' یہاں تک کہ جب وہ آپ کے پاس آتے ہیں جھگڑا کرتے ہوئے تو وہ لوگ جو کفر پر جم چکے ہیں کہتے ہیں کہ یہ سب اگلوں کی کہانیوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور وہ دوسروں کو بھی روکتے ہیں اس سے اور خود بھی محروم رہتے ہیں اس سے' اور وہ نہیں برباد کر رہے مگر صرف اپنے آپ کو لیکن انہیں اس کا شعور حاصل نہیں!"

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے قانونِ ہدایت وضلالت کی زد میں آئے ہوئے شامت زدہ لوگوں کا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے کہ وہ اپنی ضد یا تعصب یا اپنے مفادات اور مصلحتوں کے باعث اندھے' بہرے ہو چکے ہوتے ہیں' اور نہ کوئی عقلی و برہانی دلیل اُن کی آنکھیں کھول سکتی ہے نہ کوئی حسّی وظاہری معجزہ۔ بایں ہمہ وہ عوام النّاس کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے کی غرض سے یہ سوانگ رچاتے ہیں کہ بن بن کر حضورؐ کے پاس آتے ہیں اور بظاہر کان لگا کر آپ کی بات سُنتے ہیں اور پھر یہ کہتے ہوئے اُٹھتے ہیں کہ آپؐ نے کوئی نئی بات تو نہیں کہی' یہ تو سب اگلوں کی فرسُودہ باتیں ہیں' تاکہ عوام کو باور کرا سکیں کہ انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو علیٰ وجہ البصیرت رد کیا ہے' نہ کہ محض ہٹ دھرمی سے۔ آخر میں فرمایا کہ دنیا میں عارضی طور پر اُن کی چال کارگر ہو جائے تب بھی حقیقت میں تو یہ اپنے لیے ہلاکت اور بربادی ہی کا سامان جمع کر رہے ہیں۔ کاش کہ انہیں اس کا شعور ہوتا!

آخری چار آیات میں آخرت کے دو قسم کے منکرین کے انجام کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ ایک[1] وہ جو دنیا کی محبت کے باعث آخرت کی جانب سے آنکھیں تو بند کیے رہتے ہیں لیکن ان کے دل کو یہ دھڑکا بھی لگا رہتا ہے کہ مبادا حساب وکتاب اور جزا وسزا کی گھڑی آ ہی جائے' اور دوسرے[2] وہ جو دھڑلے کے ساتھ آخرت کا صاف صاف انکار کرتے ہیں۔

پہلی قسم کے لوگوں کے بارے میں فرمایا:

وَلَوْ تَرٰٓی اِذْ وُقِفُوْا عَلَی النَّارِ فَقَالُوْا یٰلَیْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُکَذِّبَ بِاٰیٰتِ

رَبَّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ۲۷ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ ۲۸

"اور کاش تم دیکھ پاتے جب وہ دوزخ کے کنارے کھڑے کیے جائیں گے تو کہیں گے: کاش ہمیں پھر دنیا میں بھیج دیا جائے تو ہم اپنے رب کی آیات کی تکذیب نہ کریں بلکہ مومنوں میں شامل ہو جائیں۔ حالانکہ اس وقت اُن پر کھلے گا وہی کچھ جس کو وہ پہلے چھپائے پھرتے تھے۔ اور اگر اُن کو لوٹا دیا جائے تب بھی وہ وہی کریں گے جس سے روکے گئے تھے اور ان کا یہ سارا واویلا سراسر کذب پر مبنی ہوگا۔"

گویا اس قسم کے لوگوں کا اصل مرض قوتِ ارادی کی کمزوری اور حبِّ دُنیا سے مغلوبی ہوتا ہے۔ اِس وقت بھی وہ آخرت سے صرف اسی وجہ سے غافل ہیں' ورنہ ان کی فطرت میں تو آخرت کا اقرار مضمر ہے جسے وہ جان بوجھ کر دباتے اور چھپاتے ہیں۔ قیامت کے روز جب وہ حقیقت جس کو انہوں نے شعوری طور پر دبا رکھا تھا کھل کر سامنے آئے گی تو وہ واویلا کریں گے کہ اگر ہمیں ایک اور موقع دیا جائے اور دنیا میں واپس بھیج دیا جائے تو ہم یکسر نیکی اور آخرت طلبی کی راہ اختیار کرلیں گے۔ حالانکہ بالفرض ایسا ہو جائے تو بھی وہ دوبارہ اپنی خواہشاتِ نفس سے مغلوب ہو کر یہی کچھ کریں گے جو اب کر رہے ہیں۔

اور دوسری قسم کے لوگوں کے بارے میں فرمایا:

وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝ ۲۹ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۭ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ۭ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ۭ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ ۳۰

"اور وہ کہتے ہیں: نہیں ہے ہماری زندگی مگر بس یہی دنیا کی' اور ہمیں ہرگز دوبارہ اٹھایا نہ جائے گا۔ اور کاش تم دیکھتے جب وہ کھڑے کیے جائیں گے اپنے رب کے سامنے اور وہ پوچھے گا: کیا یہ واقعہ نہیں ہے؟ تو وہ کہیں گے' کیوں نہیں' اے ہمارے رب! تو رب کہے گا: پس چکھو مزا عذاب کا بسبب اُس کفر کے جو تم کرتے رہے!"

گویا اُس وقت منکرینِ آخرت کے تجبّر و غرور اور اعراض و انکار کا پردہ چاک ہو جائے گا۔ اور اُن کی شامتِ اعمال حقیقت بن کر سامنے آجائے گی۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

حافظ جلال الدّین سیوطیؒ

(م ۹۱۱ھ)

حافظ جلال الدین سیوطی ۸۴۹ھ میں قریہ سیوط میں پیدا ہوئے جو دریائے نیل کے مضافات میں واقع ہے۔ ۸ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ حافظ سیوطیؒ نے جن اساتذہ و شیوخ سے جملہ علوم اسلامیہ یعنی تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، تاریخ، معانی و ادب وغیرہ میں تعلیم حاصل کی اُن کا تذکرہ اپنی کتاب "حسن المحاضرہ فی اخبار مصر والقاہرہ" میں کیا ہے[۱] ارباب سیر اور تذکرہ نگاروں نے آپ کے علمی تبحر اور فضل و کمال کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ :

"شیخ جلال الدین عبدالرحمان سیوطی اپنے عہد کے نہایت باکمال ائمہ فن میں سے تھے۔ فطرت کی طرف سے اُن کی ذات میں بہت سی خصوصیات اور خوبیاں ودیعت کی گئی تھیں۔ درس و تدریس، تصنیف و تالیف، افتاء و قضاء اور رشد و ہدایت میں انہیں کمال حاصل تھا۔ وہ نامور اور بلند پایہ مفسّر، محدّث، فقیہہ، ادیب، شاعر، مؤرخ اور لُغوی ہی نہ تھے، بلکہ اس عصر کے مجدد بھی تھے"[۲]

ملا علی قاری حنفی (م ۱۰۱۴ھ) نے ان کے مجدّد ہونے کا اعتراف کیا ہے[۳]

علامہ سیوطی نے ۹۱۱ھ میں انتقال کیا[۴]

علامہ سیوطی کی علمی خدمات

علوم قرآن میں علامہ سیوطی کی تفسیر "درِ منثور" بہت اہم کتاب ہے، جس

کے بارے میں ملا علی قاری (م ۱۰۱۴ھ) لکھتے ہیں کہ :

" ہمارے استاذ الاساتذہ سیوطی وہ بزرگ ہیں، جنہوں نے تفسیر ماثور کو کتاب در منثور میں زندہ کیا ہے"[۵]

علوم قرآن پر سیوطی کی دوسری کتاب " الاتقان فی علوم القرآن" ہے اور سیوطی نے اپنی اس کتاب میں علامہ بدرالدین زرکشی (م ۷۹۴ھ) کی " البرہان فی علوم القرآن" سے بہت مدد لی ہے۔

علامہ سیوطیؒ اور علم حدیث

خدمتِ حدیث میں علامہ سیوطی کی خدمات قابلِ قدر ہیں۔ اس ضمن میں ان کی پہلی تالیف " جامع الجوامع" ہے۔ اس میں آپ نے صحیح بخاری، صحیح مسلم، موطاء امام مالکؒ، جامع ترمذی، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ کو مع اسانید کے جمع کیا ہے۔

صحاح ستہ میں سے آپ نے پانچ کتابوں کی شروح لکھی ہیں یعنی

۱۔ التوشیح علی الجامع الصحیح (صحیح بخاری کی شرح ہے)
۲۔ القول الحسن فی الذب عن السنن (سنن ابن ماجہ کی شرح ہے)
۳۔ القوت المغتذی علی جامع الترمذی (جامع ترمذی کی شرح ہے)
۴۔ زہر الربیٰ علی المجتبیٰ (سنن نسائی کی شرح ہے)
۵۔ کشف الغطاء فی شرح الموطاء (موطاء امام مالکؒ کی شرح ہے)

ان کے علاوہ حافظ سیوطیؒ نے امام نوویؒ (م ۶۷۶ھ) کی کتاب " التقریب والتیسیر فی مصطلح الحدیث" جو اصولِ حدیث میں بہت عمدہ کتاب ہے، کی شرح " تدریب" کے نام سے لکھی۔ یہ کتاب طبع ہو چکی ہے اور اسے قبولِ عام حاصل ہوا ہے۔

امام محمدؐ بن علی الشوکانیؒ

(م ۱۲۵۰ھ)

امام محمد بن علی الشوکانی ۲۸ ذی قعدہ ۱۱۷۳ھ کو قریۂ شوکان از مضافاتِ صنعاء (یمن) میں پیدا ہوئے[۱] آپ کے والد علی بن عبداللہ (م ۱۲۱۱ھ) ایک جیّد عالم تھے اور چالیس سال تک عہدۂ قضا پر متمکن رہے[۲] علامہ شوکانی نے جملہ علوم اسلامیہ کی جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اس کا آپ نے تفصیل سے اپنی کتاب "البدر الطالع" میں تذکرہ کیا ہے[۳]۔ بیس سال کی عمر میں علوم متداولہ سے فراغت پائی اور ساتھ ہی فتویٰ نویسی شروع کر دی[۴] تیس سال کی عمر میں تقلید سے گلو خلاصی حاصل کر لی اور براہِ راست کتاب و سُنّت کو مشعلِ راہ بنایا۔

امام شوکانی کے تلامذہ

امام شوکانی کے تلامذہ میں علامہ محمد بن نصر الحازمی (م ۱۲۸۳ھ)، علامہ عبدالرحمان بن سلیمان السدیدی (م ۱۲۵۰ھ)، علامہ عبدالرحمان بن احمد البہکلی (م ۱۲۴۸ھ) علامہ احمد بن محمد بن علی الشوکانی (م ۱۲۸۱ھ)، مولانا عبدالحق بن فضل اللہ نیاری (م ۱۲۸۶ھ) مولانا ولایت علی عظیم آبادی (م ۱۲۶۹ھ) اور مولانا منصور الرحمان مرحوم دہلوی کے نام ملتے ہیں[۵]

علامہ شوکانی امام یمن کی نظر میں

امام یمن منصور باللہ علی بن عباس ۱۱۵۱ھ میں پیدا ہوا۔ اپنے والد مہدی باللہ کے انتقال پر ۱۱۸۹ھ میں یمن کا حاکم مقرر ہوا اور ۱۲۲۴ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ یہ بڑا سمجھدار حکمران تھا۔ اور علامہ شوکانی کی بہت قدر کرتا تھا۔

محی السنۃ مولانا سید نواب صدیق حسن خاں (م ۱۳۰۷ھ) لکھتے ہیں :

" حاکم آنجا در تعظیم و اجلال مبالغہ میکرد در ہر باب امر و نہی مقتدیٰ او بود، و مجال نداشت کہ سر موئے اُو در فعل خصومات و دیگر مہمات ملک و مال تجاوز کند و می گفت آنقدر صرف کہ مرا از دو کس مے آید از ہیچ کس نیست یکے او تعالےٰ دوم شوکانی "[۱۱]

(یمن کا حاکم شوکانی کی بہت عزت کرتا ہے۔ اوامر و نواحی کے معاملات میں انہی کے مشوروں کا پیرو ہے۔ ملکی حیات اور شرعی فیصلوں میں کیا مجال کہ شوکانی کے مخالف چلے۔ کہتا ہے کہ مجھے اللہ تعالےٰ کے بعد صرف شوکانی کا ڈر ہے۔)

علامہ شوکانی منصور کے بعد متوکل (۱۲۲۴ھ تا ۱۲۳۱ھ) اور متوکل کے بعد عبداللہ بن متوکل (۱۲۳۱ھ تا ۱۲۵۱ھ) کے عہدہائے حکومت میں پورے چالیس سال تک عہدۂ قضا پر متمکن رہے[۱۲]

علامہ محمد بن علی شوکانی نے ۱۲۵۰ھ میں انتقال کیا۔

تصانیف

علامہ شوکانی کے علمی تبحر کا اندازہ ان کی تصانیف سے ہوتا ہے اور علامہ شوکانی کی تصانیف کے مطالعہ سے ان کی مجتہدانہ شان ظاہر ہوتی ہے۔

نیل الاوطار کی تصنیف :

آپ نے اپنے بعض اساتذہ کے حکم و مشورہ سے امام مجد الدین عبدالسلام بن تیمیہ (م ۶۵۲ھ) کی کتاب "منتقی الاخبار" کی ایک بہترین شرح ۱۲۱۰ھ میں، جبکہ آپ کی عمر ۳۷ سال کی تھی، "نیل الاوطار" کے نام سے مجتہدانہ انداز سے لکھی۔ یمن کے جید علمائے کرام کی ایک جماعت اس شرح کی تصنیف کی بابت مشورہ میں شامل رہی۔ محی السنۃ مولانا سید نواب صدیق حسن خاں قنوجی (م ۱۳۰۷ھ) لکھتے ہیں

" ونحن نملی فی شرح المنتقیٰ مع حضور جماعة من العلماء وکان تالیفه فی ایام مشائخة فنبهوه علیٰ مواضع منه حتیٰ تحرّر "[۱۴]

(آپ کے اساتذہ اور دوسرے علماء کی موجودگی میں منتقیٰ کی شرح لکھی جاتی رہی، حتیٰ کہ تنقید و بحث سے خوب منقح ہوگئی۔)

نیل الاوطار ۸ جلدوں میں ہے اور علامہ شوکانی کو یہ تصنیف بہت پسند تھی۔

" وکان الشوکانی یقول : انّه لم یرض عن شیء من مؤلّفاته سواه لما هو علیه من التحریر البلیغ "[۱۵]

(امام شوکانی کو اپنی سب تصانیف میں سب سے زیادہ پسند یہی نیل الاوطار تھی۔)

علامہ شوکانی نے جن موضوعات پر قلم اُٹھایا، اُس کی تفصیل درج ذیل ہے:

تفسیر قرآن مجید و متعلقاتہ	=	۵
حدیث و فقہ حدیث	=	۱۴
فقہ	=	۷۴
توحید و عقائد	=	۱۵
اصول فقہ و متعلقاتہا	=	۴
علم الاسناد	=	۳
لغت، معانی، اشتقاق	=	۴
عام اسلامی تصانیف	=	۳
تاریخ	=	۲
متفرق	=	۳
میزان	=	۱۲۷[۱۶]

حواشی

۱؎ سیوطی حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۸۸ تا ۱۹۰

۲؎ شمس الدین محمد السخاوی، الضوء الامع ج ۴ ص ۶۵ تا ۷۰، عبدالحی بن العماد الحنبلی، شذرات الذہب ج ۸ ص ۵۱ تا ۵۵، محمد بن علی الشوکانی، البدر الطالع ج ۱ ص ۳۲۸ تا ۳۳۵۔

۳؎ ملا علی قاری، مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۴۸۔

۴؎ ابن العماد الحنبلی، شذرات الذہب ج ۸ ص ۵۵۔

۵؎ ملا علی قاری، مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۴۸۔

۶؎ شوکانی، البدر الطالع، ج ۲ ص ۲۱۵، نواب صدیق حسن خاں، ابجد العلوم ص ۸۷۷

۷؎ شوکانی، البدر الطالع، ج ۱ ص ۴۷۸ تا ۴۸۵۔

۸؎ البدر الطالع، جلد ۲ ص ۲۱۵۔

۹؎ البدر الطالع، ج ۲ ص ۲۱۹۔

۱۰؎ نواب صدیق حسن خاں۔ اتحاف النبلاء ص ۴۱۹، التاج المکلل ص ۳۳۶، ابجد العلوم ص ۸۸۷، دلیل الطالب ص ۷۶۸، ابقاء المنن والقاء المحن ص ۱۲۔

۱۱؎ نواب صدیق حسن خاں، اتحاف النبلاء ص ۴۰۹۔

۱۲؎ محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، امام شوکانی ص ۲۳،

۱۳؎ نواب صدیق حسن خاں، التاج المکلل تقصار جیود الابرار من تذکار جنود الاحرار ص ۸۲

۱۴؎ نواب صدیق حسن خاں، ابجد العلوم، ص ۸۷۸

۱۵؎ نواب صدیق حسن خاں، ابجد العلوم ص ۸۷۸

۱۶؎ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی۔ امام شوکانی ص ۵۹ تا ۶۶،

مولانا محمد عطاء اللہ (م ۱۹۸۶ء) لکھتے ہیں کہ ابجد العلوم مصنفہ صدیق حسن خاں (م ۱۳۰۷ھ) کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ امام شوکانی کا ایک مجموعۂ فتاویٰ بھی تھا، جس کا نام "الفتح الربانی فی فتاوی الامام الشوکانی" ہے۔ اس میں مندرجہ مسائل و ابحاث ان تصانیف سے علاوہ ہیں۔ الفتح الربانی کا ہر مبحث بجائے خود ایک رسالہ ہے۔ (امام شوکانی ص ۶۶)

حکمتِ اقبال (۳۷)
ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

خودی اور آرٹ (۲)

منکرِ خدا کا آرٹ

جو شخص اپنی آرزوئے حسن کی تشفی کے لیے خدا کے تصوّر سے کام نہیں لے سکتا، اس لیے کہ وہ خدا کا منکر یا کافر ہے یا خدا کے تصور سے آشنا نہیں' اس کا آرٹ اسی گھٹیا قسم کا آرٹ ہو سکتا ہے' اگرچہ وہ دیکھنے والوں کے لیے فردوسِ نظر ہو اور وہ یہ محسوس کرنے لگیں کہ اس آرٹ نے ان پر جنّت کا ایک دروازہ کھول دیا ہے اور خدا کی قدرت کے رازہائے سربستہ ان پر آشکار کر دیئے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ خودی کی تگ و دو سے مادی طور پر ترقی یافتہ بن جانا یا اس جہانِ سحر و شام کے ادوار میں سے دورِ جدید کا انسان بن جانا ایسے کارہائے نمایاں بھی حق و باطل اور زشت و زیبا کی اس حریفانہ کشمکش سے' جو انسانی زندگی کی ایک خصوصیّت کے طور پر انسان کے ضمیر کے اندر اور باہر جاری ہے' انسان کو نجات نہیں دلا سکتے۔ اس سے نجات پانے کا طریق صرف یہ ہے کہ انسان خدا پر ایمان لائے اور خدا کی محبّت کو ترقی دے کر کمال پر پہنچائے۔ اس زمانہ کے کافر نے ایک نئی قسم کی بُت پرستی کو' جس میں لات و منات کی بجائے وطن و قوم اور رنگ و نسل کو اصنام بنایا جاتا ہے' اپنا شعار بنا لیا ہے۔ خدا سے بیگانگی کے اس زمانہ میں اس کافر سے ہم اس سچے آرٹ کی توقع کیسے کر سکتے ہیں جو صرف عشقِ حقیقی سے زندگی پانے والوں کا ہی امتیاز ہے۔ وہ مر چکا ہے اور یہی اس کا آرٹ جو غیر حسن کو حسن' موت کو حیات' اور قبر کی تاریک رات کو زندگی کی روشنی سمجھتا ہے اس کا جنازہ پڑھا رہا ہے۔

ہے یہ فردوسِ نظر اہلِ ہنر کی تعمیر
فاش ہے چشمِ تماشا پہ نہاں خانۂ ذات!
نہ خودی ہے' نہ جہانِ سحر و شام کے دَور
زندگانی کی حریفانہ کشاکش سے نجات!

آہ! وہ کافرِ بے چارہ کہ ہیں اس کے صنم
عصرِ رفتہ کے وہی ٹوٹے ہوئے لات و منات!
تُو ہے میت! یہ ہنر تیرے جنازے کا امام
نظر آئی جسے مرقد کے شبستاں میں حیات!

انسان کی تمام اعلیٰ سرگرمیوں کا مقصد خودی کی حفاظت اور تربیت ہے

سرود و شعر اور ہنر کی دوسری قسمیں ہی نہیں، بلکہ ادب اور دین و سیاست بھی انسان کے ایسے اعمال ہیں جن کا منبع بندۂ خاکی کا دل یا اس کی آرزوئے حسن ہے۔ یہ اعلیٰ قسم کے اعمال انسان کا خاص امتیاز ہیں اور حیوان کے حصّہ میں نہیں آئے۔ ان کا مقصد خدا کی محبت کے اسی جذبہ کی تشفی اور خدمت و اعانت ہے جو انسان کو اشرف المخلوقات اور خدا کا خلیفہ اور ہمراز و ہم کار بناتا ہے۔ ان اعمال کے نتائج اور فوائد میں سے ہر ایک اپنی قدر و قیمت میں ایک نایاب اور قیمتی موتی کی طرح ہے۔ لہٰذا اس میں ذرا شک نہیں کہ ان اعمال کا مقام ستاروں سے بھی بلند تر ہے لیکن اگر ان میں سے کوئی خودی کی (یعنی خودی کی محبت کی جو فقط خدا کے لیے ہوتی ہے) حفاظت اور تربیت نہ کر سکے تو محض بے سود اور بیکار ہے، کیونکہ اس سے زندگی کے مقصد کو اور اس عمل کے اپنے مقصد کو بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اور اگر وہ عمل خودی کی حفاظت اور تربیت کرنے والا ہے تو عین زندگی ہے۔ اس دنیا میں جن قوموں نے اپنے دین اور اپنے ادب کو خودی کی تربیت اور ترقی کے مقصد سے بے تعلق کر لیا تھا وہ ذلیل ہو کر رہی ہیں۔

سرود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ!
ضمیرِ بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی
بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ!
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ!

ہوئی ہے زیرِ فلک اُمّتوں کی رُسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ!

اگر آرٹ میں خودی کی تعمیر یعنی خدا کی محبت کی نشوونما کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو خواہ وہ مصوری ہو یا شاعری، موسیقی ہو یا گانا، وہ افسوسناک ہے۔ انسان کے لیے زندگی خدا کی محبّت ہے اور موت خدا سے دُوری، لیکن افسوس کہ مکتب ہو یا میکدہ (یعنی آرٹ جو حسن کی نمائش سے مست کرتا ہے) اس وقت دونوں بے خدا ہونے کی وجہ سے موت کا درس دے رہے ہیں۔ ہمیں جینا سیکھنا چاہیے اور اصل جینا خودی کا جینا ہے۔ اگر ہماری خودی زندہ ہو جائے تو ہم اس دنیا میں بھی زندہ رہیں گے اور اگلی دنیا میں بھی۔ بدن کی زندگی جو شرر کی طرح ایک لمحہ سے زیادہ نہیں ہوتی ہماری اصل زندگی نہیں۔ انسان کی اصل بدن سے نہیں بلکہ روح سے ہے۔ بدن روح سے ہے، روح بدن سے نہیں۔ زندہ رہنے کے لیے ہمیں وجود یا زندگی کے لوازمات اور مقامات و مدارج کو سمجھنا چاہیے۔

اے کہ ہے زیرِ فلک مثلِ شرر تیری نمود
کون سمجھائے تجھے کیا ہیں مقاماتِ وجود
گر ہنر میں نہیں تعمیرِ خودی کا جوہر
وائے صورت گری و شاعری و نائے و سرود
مکتب و میکدہ جز درسِ نبودن ندہند
بودن آموز کہ ہم باشی و ہم خواہی بود!

آرٹ کی تاثیر کا منبع

آرٹ یا ہنر کی ساری مشکلوں اور کوتاہیوں کا سبب سمجھنے کے لیے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ جب ایک نَے نواز اپنی نَے سے اثر میں ڈوبی ہوئی مست کرنے والی سُریں نکالتا ہے تو نَے کی آواز میں شراب کا سا سُرور کہاں سے آجاتا ہے۔ یقیناً اس کا منبع نَے کی سوکھی ہوئی لکڑی نہیں بلکہ نَے نواز کا دل ہے۔ تو پھر یہ دل کیا چیز ہے۔ اس میں مست کرنے کی خاصیت اور اثر پیدا کرنے کی طاقت کہاں سے آئی ہے۔ یہی دل انسان کی خودی ہے، جو اصل انسان ہے اور اس دل

میں فقط ایک ہی آرزو ہے اور وہ آرزوئے حسن ہے' جو صرف خدا کی محبّت سے مکمل اور مستقل طور پر مطمئن ہوتی ہے۔ عبادت' علم' اخلاق اور ہنر ایسے اعمال انسان کی اسی آرزوئے حسن کے پہلو ہیں اور اسی کی اعانت کے لیے وجود میں آتے ہیں۔ غلط اور ناقص اور نازیبا تصورات زیبائی کا لباس اوڑھ کر خدا کی محبّت کے جذبہ کو اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں لیکن اس کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ یہ غیر اللہ سے کٹ کر بالکل خدا کے لیے ہو جائے۔ اور جب یہ کلیۃً خدا کے لیے ہو جاتا ہے تو انسان کا دل زندہ ہو جاتا ہے اور وہ سچ مچ صاحبِ دل بن جاتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ صاحبِ دل کی ایک نگاہ سے شہنشاہِ ایران کا تخت الٹ سکتا ہے اور اس کی نگاہ میں روم اور شام اور اس کی سلطنتوں کی بھی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ جب دل خدا کی محبت سے زندہ ہوں تو قوم بھی زندہ ہوتی ہے اور جب دلوں سے خدا کی محبت رخصت ہو جائے اور دل مردہ ہو جائیں تو قوم بھی مر جاتی ہے۔ دل کی واردات پَے بہ پَے بدلتی رہتی ہیں کیونکہ اس میں جلال بھی ہے اور جمال بھی۔ جب اس کی محبّت کو رکاوٹوں کا سامنا ہونے لگے تو یہ جلالی صفات کا مظاہرہ کرتا ہے جس سے محبت کی رکاوٹوں کو فنا کر دیتا ہے۔ اور جب اس کی محبّت کو موافق حالات پیش آئیں تو یہ حریر و پرنیاں کی طرح نرم ہو جاتا ہے اور سراسر محبّت نظر آنے لگتا ہے۔ اگر ایک فنکار کی ناقص' ناتمام اور راہ گم کردہ محبّت بھی اس کی نَے کے نالوں میں کچھ اثر پیدا کر سکتی ہے تو پھر خود ہی سمجھ لیجئے کہ اگر اس کی محبت اپنے حقیقی محبوب کے لیے ہو گی اور درجۂ کمال پر ہو گی تو اس کے نالۂ نَے میں تاثیر اور مستی کس درجہ کی ہو گی اور اس کا فن عمدگی کے کس مقام پر ہو گا۔ اگر فنکار یہ راز پا جائے تو اس کو فن کی تمام مشکلات کا حل یہیں سے ملے گا۔ اقبال اسی مضمون کو شعر میں بیان کرتا ہے۔

آیا کہاں سے نالۂ نَے میں سرورِ مے — اصل اس کی نَے نواز کا دل ہے کہ چوبِ نَے؟
دل کیا ہے اس کی مستی و قوت کہاں سے ہے؟ — کیوں اس کی اک نگاہ الٹتی ہے تختِ کے؟
کیوں اس کی زندگی سے ہے قوم میں حیات؟ — کیوں اس کے واردات بدلتے ہیں پَے بہ پَے؟
کیا بات ہے کہ صاحبِ دل کی نگاہ میں — جچتی نہیں ہے سلطنتِ روم و شام و رے؟
جس روز دل کی رمز مغنّی سمجھ گیا — سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے!

ہنر کے کمال کا معیار

ایک فن کار کے متعلق بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ اہلِ نظر ہوتا ہے' حسن کا ذوق رکھتا ہے' اور حسن کو غیرِ حسن سے ممیّز کر سکتا ہے۔ لیکن اگر ایک فنکار خود فن کی حقیقت اور اس کے مقصد سے ناآشنا ہو تو ہم اسے اہلِ نظر کیسے کہہ سکتے ہیں۔ ہنر کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے دل میں خدا کی سچی محبت کا ایسا سوز پیدا ہو جو اس کو زندۂ جاوید بنا دے۔ یہ مقصد اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ ہنر کی تخلیق اس قسم کی ہو کہ وہ خدا کی محبّت کی نشو و نما کر سکے۔ اگر فنکار غیرِ حسن کو حُسن بنا کر پیش کرے تو اس کا فن بدن کی اس زندگی میں' جو شرر کی طرح ایک دو لمحہ کے لیے ہی ہوتی ہے' کسی قدر لذّت یا سرور کا باعث ہو تو ہو' لیکن نہ تو وہ خدا کی محبّت کی تربیت کر سکے گا اور نہ ہی روح کی ابدی زندگی اور اس کی محبت کے ابدی سوز کے لیے ممد و معاون ثابت ہو سکے گا۔ لیکن بدن کی اس نفس یا دو نفس کی زندگی کی حقیقت کیا ہے کہ فن کار اپنے فن کو اس کا غلام بنا دے۔ ابرِ نیساں کا قطرہ اگر کسی صدف میں جا پڑے تو وہ گہر بن جاتا ہے۔ فن کار کا جوہر وہ قطرۂ نیساں ہی سہی جو اس کے شاہکار کے صدف کو حسن کے گوہرِ تابدار سے پُر کرتا ہے' لیکن وہ صدف یا وہ گوہر جو قطرۂ نیساں کے کمالات کی تخلیق ہونے کے باوجود دریا میں تلاطم پیدا نہ کر سکے' دریا کے لیے بے حقیقت ہے۔ اسی طرح سے فن کا وہ شاہکار اور فن کا وہ حسن جو قوم کے اندر خدا کی رضامندی کے حصُول کے لیے عمل کی کوئی حرکت پیدا نہ کر سکے' قوم کے لیے بے معنی اور بے کار ہے۔ بادِ سحر سے چمن میں پھول کھلتے ہیں اور یہ صحیح ہے کہ شاعر کی شاعری اور گانے والے کا گانا دونوں چمنِ قوم کے لیے بادِ سحر کا کام دے سکتے ہیں لیکن وہ بادِ سحر بے کار ہے جس سے قوم کا گلستان خدا کی محبّت سے شگفتہ ہونے کی بجائے خدا کی محبّت سے محروم ہو کر مرجھا جاتے۔ ایک ایسی قوم جو حالتِ جمود میں ہو' جب تک اس کے لیے کسی معجزہ سے فکر و عمل کی نئی راہیں نہ کھل جائیں' وہ انسانیت کی منزلِ مقصود کی طرف حرکت نہیں کر سکتی۔ ہنر ایسا ہونا چاہیے جو عصائے کلیمی کی طرح ہو' جس کی ایک ضرب سے بے آب و گیاہ بیابان میں پتھر سے پانی کے چشمے پھُوٹ نکلے تھے' جو ایک معجزہ کا حکم رکھتا ہو اور ایک حیرت انگیز فکری انقلاب سے قوم کو ارتقار کے کھوتے ہوئے راستوں پر ڈال سکتا ہو۔ اقبال کہتا ہے:

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا!
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا، وہ گہر کیا!
شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا!
بے معجزہ دنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا!

خطرناک شاعری

اگر شعر خودی کی آرزوئے حسن کے اصل مقصود کو پیش نظر نہ رکھ سکے تو یہ انسانیت کے لیے نہایت ہی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے، کیونکہ یہ فن کی اور قسموں کی نسبت زیادہ آسانی کے ساتھ عوام تک پہنچ جاتا ہے۔ اس سے تھوڑے خرچ پر اور بار بار استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر یہ اظہارِ مطلب کے لیے زیادہ موزوں اور موثر ہے۔ انسانی جذبات کو زیادہ آسانی کے ساتھ اپنے ضبط میں لا سکتا ہے اور ہماری روزمرہ کی زندگی سے باسانی تعلق پیدا کر سکتا ہے۔ اگر شاعر مقصودِ حیات سے ناآشنا ہو تو پھر وہ زشتی اور نازیبائی کو حسن بنا کر پیش کرتا ہے، انسان کے ارتقا کی راہ میں ایک رکاوٹ پیدا کر دیتا ہے، موت کو زندگی اور زندگی کو موت کا رنگ دے کر سامنے لاتا ہے، ایسا زہر تقسیم کرتا ہے جو شہد میں حل کیا گیا ہو۔ بعض اوقات اس کا نقصان حساب سے باہر ہو جاتا ہے کیونکہ وہ لاتعداد انسانوں کی آرزوئے حسن کی غلط راہوں اور غلط منزلوں کی طرف راہ نمائی کر کے ان کو بڑی بڑی مصیبتوں میں مبتلا کر دیتا ہے جن سے وہ مر کر ہی نجات پاتے ہیں۔ ایسے شاعر کا کلام پھول کو تازگی سے اور بلبل کو ذوقِ پرواز سے محروم کر دیتا ہے۔ گویا اس کے اثر سے نہ حسن میں شوخی باقی رہتی ہے اور نہ عشق میں گرمی۔ انسان خیالات کے بحرِ بیکراں میں غرق ہو جاتا ہے اور عمل سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اس کا کلام شراب کی سی مستی ضرور پیدا کرتا ہے، لیکن ہر انسان کو اپنی خودی کی سلامتی کے لیے اس کی ٹپکتی ہوئی شراب سے بچنا چاہیے۔ جس بدقسمت قوم میں ایسا شاعر پیدا ہو وہ اجل سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔

وائے قومے کز اجل گیرد برات
شاعرش وابوسد از ذوقِ حیات
خوش نماید زشت را آئینہ اش
در جگر صد نشتر از نوشینہ اش

بوسۂ اُو تازگی از گل برد ذوقِ پرواز از دلِ بلبل بَرد
دریم اندیشہ اندازد ترا از عمل بیگانہ مے سازد ترا
از خم و مینا و جامش الحذر از مے آتیشہ فامش الحذر

مقدس شاعری

اس کے برعکس اگر شعر خودی کی آرزو ئے حسن کے مقصود سے آگاہ ہو تو عالمِ انسانی کے ارتقاء کا ایک مفید اور مؤثر ذریعہ بن جاتا ہے۔ ایسا شعر کہنے والے شاعر کے متعلق اقبال لکھتا ہے کہ اس کا سینہ حسن کی جلوہ گاہ ہوتا ہے جس سے حسن کا نور پھیلتا ہے۔ وہ اپنے شعر سے جس چیز کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس کے حسن میں اضافہ کر دیتا ہے۔ قدرت کا حسن بھی اس کے کلام کے جادو سے اور زیادہ دلکش اور محبوب ہو جاتا ہے۔ اس کا فکر بلندی میں چاند اور ستاروں تک پہنچتا ہے۔ وہ زشتی کو جانتا ہی نہیں اور حسن کو پیدا کرتا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ قافلے اس کی بانگِ درا سے اس کے پیچھے اپنی منزلوں کی طرف چل پڑتے ہیں۔

سینۂ شاعر تجلّی زارِ حسن خیز و از پہنائے او انوارِ حسن
از نگاہش خوب گردد خوب تر فطرت از افسونِ او محبوب تر
فکرِ اُو با ماہ و انجم ہم نشیں زشت را ناآشنا خوب آفریں
کاروانہا از درایش گام زن در پئے آوازِ نایش گام زن

جس طرح سے دل جسم کے اندر احساسات کا مرکز ہوتا ہے' شاعر ایک قوم کے لیے جذبات اور احساسات کا مرکز ہوتا ہے۔ وہ اپنی محبت کے سوز سے' جو شاعری کی جان ہے' ایک نئی دنیا پیدا کرتا ہے۔ خدا کی محبّت کا سوز کائنات کے ہر ذرّہ میں ہے' اسی سے پوری کائنات کی تعمیر ہوئی ہے۔ وہ شاعری جو اس سے خالی ہے ایک طرح کا ماتم ہے۔ اگر شعر کا مقصود خدا کی محبّت کی بنیاد پر انسانیت کی تعمیر ہو تو وہ نبوّت کا وارث ہے۔

شاعر اندر سینۂ ملّت چو دل ملّتے بے شاعرے انبارِ گِل
سوز و مستی نقشبندِ عالمے است شاعری بے سوز و مستی ماتمے است

شعر را مقصود اگر آدم گری است　　شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

لہٰذا اقبال شاعر کو دعوت دیتا ہے کہ وہ زندگی کے مقصد کو اپنے ہنر کا معیار قرار دے۔ اگر اس کی شاعری خدا کی محبّت کو فروغ دینے کے کام آرہی ہے تو قابل قدر ہے ورنہ نہیں۔

اے میانِ کیسہ ات نقدِ سخن
بر عیارِ زندگی او را بزن

اگر ہنر کار کا ہُنر خدا کی محبّت کے جذبہ کی عملی تسکین اور تشفی کے لیے کام نہیں آرہا تو وہ یقیناً قوموں کی بربادی کا سبب بنے گا۔ ایسے ہنر سے گریز واجب ہے۔

نہ جُدا رہے نوا گر تب و تابِ زندگی سے
کہ ہلاکیٔ اُمم ہے یہ طریق نے نوازی!

غلام اور کافر کا آرٹ

چونکہ آرٹ خودی کی آرزوئے حسن کے آزادانہ اظہار پر موقوف ہوتا ہے' ایک غلام یا ایک ایسا آدمی جس کا تصوّرِ حقیقت صحیح نہ ہو اعلیٰ قسم کا آرٹ پیدا نہیں کر سکتا۔ اکثر اوقات اس کے آرٹ کا مقصد یا فطرت کی نقل ہوتا ہے یا ان افراد کے ذوق کی ترجمانی اور خدمت گزاری جن کو یہ آرٹ محظوظ کرنا چاہتا ہے۔

ایک غلام اپنی پوری آرزوئے حسن کے مطابق ایجاد و تخلیق کی اہلیّت سے محروم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی خودی اپنے صحیح تصوّرِ حقیقت کے لیے نہیں بلکہ اپنے آقاؤں کے غلط تصوّرِ حقیقت کے لیے سوچنے اور کام کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کی ایجاد و تخلیق کی قوتیں اپنا آزادانہ اور مکمل اظہار نہیں پا سکتیں۔ اس کا آرٹ جدّت کے وصف سے عاری ہوتا ہے۔ آرٹ حسن کے آزادانہ اظہار کا نام ہے۔ چونکہ غلام کا آرٹ حسن کا آزادانہ اظہار نہیں ہوتا' لہٰذا وہ سچا آرٹ بھی نہیں ہوتا۔ ایک فن کار اپنے آرٹ میں اپنے آپ کا مکمل آزادانہ اظہار اسی صورت میں کر سکتا ہے جب اس کی خودی ہر قسم کے زشت اور ناقص تصوّراتِ حقیقت کے اثر سے آزاد ہو۔ ناقص تصوّراتِ حقیقت چونکہ خودی کی فطرت سے مطابقت نہیں رکھتے' وہ اس کی آزادی کو سلب کر کے

اسے اپنا غلام بنا لیتے ہیں' جس کے بعد وہ اپنے آپ سے بیگانہ ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں خودی آزادانہ تخلیق کے قابل نہیں رہتی۔ لہٰذا خدا سے کفر اور غلامی دونوں حالتیں اعلیٰ قسم کے آرٹ کے لیے سازگار نہیں۔ بلند ترین سطح کا آرٹ صرف اسی حالت میں ممکن ہے جب فن کار کی خودی ہر قسم کے غلط تصوراتِ حقیقت کے اثر سے مکمل طور پر آزاد ہو' خواہ یہ اثر کفر سے پیدا ہو رہا ہو یا غلامی سے۔ غلامی کی حالت میں پیدا ہونے والے فنونِ لطیفہ کے اندر کسی قسم کی ہلاکتیں مخفی ہوتی ہیں غلامی کے ساحرانہ اثرات کا ذکر کیا جائے' غلام کی فنی مخلوقات اُس کے دل ہی کی طرح بے نور ہوتی ہیں' اُس کی سُریں اُس کے دبے ہوئے دل و دماغ ہی کی طرح پست ہوتی ہیں' اُس کی نَے کی آواز ہی سے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ غلام ہے۔ اُس کا ساز انسانوں کی ایک پوری بستی کے لیے موت کا پیغام ہوتا ہے۔

مرگ ہا اندر فنونِ بندگی — من چہ گویم از فسونِ بندگی
چوں دلِ اُو تیرہ سیمائے غلام — پست چوں طبعش نواہائے غلام
از نَے اُو آشکارا رازِ اُو — مرگِ یک شہر است اندر سازِ اُو

تنظیمِ اسلامی کی انقلابی دعوت کا نقیب

ماہنامہ
میثاق
لاہور

زیرادارت: ڈاکٹر اسرار احمد

فی شمارہ -/۵ روپے سالانہ زرتعاون -/۵۰ روپے

قرآن اور جدید سائنس (۲)

پرویز ھاشمی

غور کریں تو جسم تو انسان کا کبھی ایک سا نہیں رہتا۔ جو جسم ہمارا بچپن میں ہوتا ہے وہ اس سے مختلف ہوتا ہے جو جوانی میں ہوتا ہے۔ اسی طرح بڑھاپے میں ہمارا جسم جوانی سے مختلف ہوتا ہے۔ بلکہ اب تو جدید سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ ہمارے جسموں کے خلیات (cells) ہر وقت بنتے اور مرتے رہتے ہیں اور کچھ ہی عرصے میں پورے کے پورے جسم کے (cells) نئے ہو جاتے ہیں یعنی پورے کا پورا جسم نیا ہو جاتا ہے۔

بہرحال قرآنِ حکیم خبردے رہا ہے کہ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے جو کامیابی کی صُورت میں جنّت (Gardens) میں ہمیشہ ہمیشہ کی راحت اور خسارے کی صُورت میں کروڑوں' اربوں' کھربوں سال بلکہ لامتناہی مدّت کی ذلّت اور ایسی دردناک سزا ہوگی جس کا قرآنِ حکیم میں بیان پڑھ کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ قرآن بتاتا ہے کہ یہ کوئی ڈراوے یا استعارے نہیں بلکہ ایسا ہو کر رہے گا' اور اِس سزا کا مستحق انسان خود اپنے ہی ہاتھوں اللہ تعالیٰ کے پیغام کے مطابق زندگی نہ گزارنے کی صُورت میں بن جاتا ہے۔ قرآن کے مطابق تمام بنی نوعِ انسان میں عدل و انصاف صرف اُس صورت میں ممکن ہے جبکہ ہر فرد صرف اُس کے دیئے ہوئے طریقے پر چلے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں تم سے رزق کا تقاضا نہیں کرتا' میں تو تمہیں خود رزق دیتا ہوں۔

"میں نے جنّوں اور انسانوں کو صرف اس لئے بنایا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ میں اُن سے رزق نہیں مانگتا' نہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلایا کریں۔ اللہ سب کو رزق دینے والا اور مضبوط قوت والا ہے۔" (سورۃ الذّٰریٰت: آیت ۵۸۔۵۶)

یہ نظام جو میں نے دیا ہے اُسے قائم رکھو گے تو نسلِ انسانی میں سے کسی پر ظلم نہ ہوگا وگرنہ فساد ہی فساد ہوگا جیسا کہ آج کل دُنیا میں ہے۔

"بحر و بر میں ہر جگہ انسانوں کی کرتوتوں کے باعث فساد چھا گیا" (سورۂ روم - آیت ۴۱)

جنت اور جہنم کا ویزا تو انسان درحقیقت اِس دنیا سے لے کر ہی جاتا ہے۔ روزِ محشر کو ہماری زندگی کی ویڈیو فلم جو تیار کی جا رہی ہے' سب کے سامنے ہمیں دکھا دی جائے گی تاکہ خود ہمارے ساتھ ساتھ دوسروں پر بھی انصاف کا واقع ہونا بالکل واضح ہو جائے۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ جہنم تو ایک صفائی خانہ ہے۔ غلط طریقے سے زندگی گزارنے کے نتیجے میں جو گند انسان اپنے اوپر اِس دُنیا سے لے جاتا ہے' اُس کی صفائی صرف جہنم ہی میں ممکن ہے۔ دھوبی کپڑے کو کوٹتا پیٹتا ہے' اُسے آگ پر چڑھاتا ہے' اُسے کپڑے سے تو کوئی دشمنی نہیں ہوتی' اس کا مقصد تو وہ گند نکالنا ہوتا ہے جو کپڑے میں موجود ہے۔ اب اس صفائی میں گندگی کے تناسُب سے کروڑوں' اربوں اور کھربوں سال بھی لگ سکتے ہیں کیونکہ وہاں کے پیمانے ہماری دُنیا کے مقابلہ میں بہت بہت بڑے ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے انسان ان سب چیزوں کا یقین آسانی سے کرنے والا نہیں' لہٰذا وہ قرآن میں بار بار نہایت منطقی اور سائنٹیفک طریقہ سے انسان کی توجہ کائنات میں موجود اپنی نشانیوں کی طرف دلاتا ہے تاکہ ہم جان سکیں کہ ہم ہر چیز کو صرف اپنے پیمانوں سے ناپ تول نہیں سکتے۔

کیا ہمیں معلوم ہے کہ ہماری زمین جو ہمیں اتنی وسیع اور عریض نظر آتی ہے' کائنات میں اس کی حیثیت سمندر میں ایک قطرے سے بھی بہت کم ہے۔ ویسے تو ہماری زمین کا Diameter (قطر) ۷۹۱۸ میل ہے' اور یہ خلا میں سورج کے گرد ۷۰ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھوم رہی ہے۔ یعنی ایک دن کے اندر اندر یہ ہمیں لے کر سولہ لاکھ اسّی ہزار میل طے کر جاتی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ ہمارے سر کا ایک بال تک بھی نہیں ہلتا۔ اگر کبھی ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ڈرائیور گاڑی چلائے تو ہمارا دل دہلنے لگتا ہے۔

ہمارا سورج ہماری اس زمین سے ۱۴ لاکھ گنا بڑا ہے اور یہ بھی خلا میں ۷ لاکھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کر رہا ہے۔ ہمارا یہ سورج باوجود اپنے اس عظیم حجم کے' ہماری گلیکسی کا جسے ہم کہکشاں کہتے ہیں' ایک چھوٹا سا ستارہ ہے۔ ہماری یہ گلیکسی بھی ساکن نہیں بلکہ یہ بھی ۱۲ لاکھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے خلا میں سفر کر رہی ہے۔ ہماری اس

کہکشاں میں سورج کے علاوہ ایک کھرب ستارے اور بھی ہیں جن میں بعض ستارے سورج سے کروڑہا گنا بڑے ہیں۔ مثلاً ستارہ Antares سورج سے تقریباً چھ کروڑ گنا بڑا ہے' ۵ ہزار گنا زیادہ روشن اور ۳۳۰ نوری سال یعنی Light year دُور ہے۔

اسی طرح ایک اور ستارہ Betelgeuse ہے' جو Antares سے بھی بڑا ہے' سورج سے ۱۷ ہزار گنا زیادہ روشن اور ۲۷۰ نوری سال دُور ہے۔ اس سے پانچ کروڑ میل بلند شعلے اٹھتے ہیں جو دُوربین کی مدد سے دیکھے جا سکتے ہیں جن کی بے انتہا خوفناک اور دہشت ناک شکل اللہ تعالیٰ کی قوتِ جلالی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اگر اِن ستاروں کو سورج کی جگہ رکھ دیا جائے تو ہماری دُنیا بلکہ ہمارے Solar System میں سوائے آگ کے کچھ نہ ہو۔ Auniga اور Cephei ہماری گلیکسی کے اور بھی بڑے ستارے ہیں۔ انسان ان آجرامِ فلکی کے سائزوں' چمکوں اور رفتار کے تصور سے کانپ جاتا ہے۔ ان کی تخلیق کے متعلق سوچنے لگیں تو عقل ساتھ نہیں دیتی۔ ذرا فاصلوں پر غور کریں! اگر ہم روشنی کی رفتار جو کہ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے' سے بھی سفر کریں تو اپنی ساری زندگی میں اُن تک نہیں پہنچ سکتے۔

یہ تمام ستارے رات کے کسی حصّے میں آسمان پر چمکتے دیکھے جا سکتے ہیں مگر چونکہ ہمیں ان کی عظمت کا علم نہیں لہٰذا وہ ہمارے لئے محض ایک معمولی سا نقطہ ہوتے ہیں۔

علم کی فضیلت اس بات سے واضح ہوتی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے جو حکم انسانوں کو سب سے پہلے دیا گیا وہ علم کے حصول سے متعلق تھا کیونکہ علم کے بغیر نہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کا ہمیں پتا چل سکے گا اور نہ ہم اس کی صحیح معرفت حاصل کر سکیں گے اور پھر نہ اُس سے ہم اتنا ڈریں گے جتنا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے۔

"بے شک اللہ تعالیٰ سے وہی ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں"۔ (فاطر ۳۵ - آیت ۲۸)

بہرحال یہ داستان تو صرف ہماری گلیکسی کے ایک کھرب ستاروں میں سے چند ایک کی ہے جس کے پیمانے بھی شاید ہماری محدود عقل میں آنے مشکل ہیں۔ اس سے آگے چلیں تو خود ہماری گلیکسی کا کائنات میں کوئی مقام نہیں۔ ہم اپنی گلیکسی کے علاوہ صرف آنکھ کی مدد سے مزید تین گلیکسیاں دیکھ سکتے ہیں۔ ان میں ایک Andromeda ہے جو ہم سے ۲۱ لاکھ ۸۰ ہزار نُوری سال دور ہے۔ مزید دو Magellanic Clouds میں

سے پہلا ہم سے ایک لاکھ ستّر ہزار نُوری سال دُور ہے اور دوسرا دو لاکھ نُوری سال دُور ہے۔ ان کے علاوہ وہ گلیکسیاں بھی ہیں جو صرف آنکھ سے دیکھی نہیں جا سکتیں بلکہ ان کو دیکھنے کے لئے دُوربین ضروری ہے۔ ان گلیکسیوں کی تعداد کسی گنتی میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ ماؤنٹ وِلسن کیلیفورنیا میں نصب شدہ ۲۰۰ انچ بڑی دوربین سے وقتِ واحد میں ہم تقریباً ایک ارب گلیکسیاں دیکھ سکتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے قریب نہیں بلکہ اِن کے درمیان فاصلے ہزاروں لاکھوں Light years کے ہیں۔ اور یہ تمام گلیکسیاں ساکن بھی نہیں بلکہ اپنے مرکز کے گرد گھوم رہی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ خلا میں چل بھی رہی ہیں۔ ان میں سے بعض کی رفتار کروڑہا میل فی گھنٹہ ہے اور یہ ہم سے کروڑوں اربوں نُوری سال دُور ہیں۔ اس وقت کی Latest دُوربین سے ہم ۳ کے بعد ۲۲ صفر میل تک دیکھ سکتے ہیں۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ اگر ہم اپنی دُوربین لے کر اس فاصلے کے آخر پر پہنچ جائیں تو بھی یہی نظارہ ہوگا اور اس سے آگے بھی یہی نظارہ ہوگا کیونکہ اس کائنات میں لگاتار وسعت ہو رہی ہے۔ سائنس دانوں کو یہ حقیقت ۲۰ویں صدی میں معلوم ہوئی مگر قرآن حکیم نے ۱۴۰۰ سال پہلے ہی یہ اطلاع ہمیں دے دی تھی۔

"And we built the Heaven, with the twist of the Divine Hand and We surely expanding it"

"اور آسمانوں کو ہم نے اپنی قدرت (قوت) سے بنایا اور یقیناً ہم اس میں وسعت کر رہے ہیں" (الذّٰریٰت ۵۱۔آیت ۷)

سو یہ ہے اس کائنات کے پیمانوں کا ہلکا سا عکس! جو انسان بھی اس بے پایاں وسعت و قوت' متحیّر کُن رفتار اور نُور کے سیلاب پر غور کرے گا تو یقیناً وہ پکار اٹھے گا "اے ہمارے ربّ تو نے یہ (کائنات) بے مقصد پیدا نہیں کی" (آلِ عمران ۳ ۔ آیت ۱۹۱) اور انسان کو اپنی زندگی اور یہ دنیا مصنوعی سی لگنے لگے گی اور اس کا دل کانپنے لگے گا اور اس کے لئے یہ یقین کرنا قطعاً مشکل نہ رہے گا کہ اصل زندگی واقعی موت کے پردے کے پیچھے آخرت کی زندگی ہے' جسے ممکن بنانے والا کوئی ہماری طرح کا عاجز انسان نہیں بلکہ وہ ہستی ہے جس نے یہ عجوبہ کائنات بنائی ہے۔ سورۃ النّٰزِعٰت میں اللہ تعالیٰ انسان سے سوال پوچھتے ہیں :

"کیا تمہیں دوبارہ بنانا مشکل ہے یا اس کائنات کو' جسے ہم نے بنایا ہے" (النّٰزِعٰت ۷۹ - آیت ۲۷)

اس سوال کا جواب کوئی بھی انسان جسے اللہ کے ہونے کا یقین ہے' کیا دے سکتا ہے سوائے اس کے کہ اے اللہ واقعی تیرے لئے میرا دوبارہ بنانا مشکل نہیں۔ مگر یہ جواب دینے میں پہلے اُسے اِس کائنات کے بارے میں علم حاصل کرنا بہت ضروری ہے وگرنہ شاید اسے اپنا دوبارہ پیدا ہونا ہی مشکل نظر آتا رہے گا ------ اور یہ اسے مشکل کیونکر نظر آتا ہے' اس کا سبب اللہ نے بیان فرمایا کہ وہ اللہ کو Evaluate نہ کر سکے (اس کی قوت و عظمت کا اندازہ نہ کر پائے) جیسا کہ اسے Evaluate کرنے کا حق تھا۔ (سورۃ الزمر - آیت ۶۷)

اس طرح کے بے شمار سوالات ہیں جو اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں انسان سے کرتے ہیں۔ اب اگر ہم قرآن کا مطالعہ ہی نہیں کریں گے' اپنا وقت' اپنی توانائی اور سب سے بڑھ کر اپنی ذہانت صَرف کر کے قرآن حکیم کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کریں گے تو کیسے پتہ چلے گا کہ اللہ ہم سے چاہتا کیا ہے؟

اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم وقت اور ذہانت اللہ کے پیغام کو سمجھنے کے لئے صَرف نہیں کریں گے تو ہمیشہ ہمارا ایک ہی اعتراض ہوگا کہ قرآن سمجھ میں نہیں آتا۔ ہمیں ٹھنڈے دل سے اپنے آپ سے ایک سوال پوچھنا ہے کہ واقعی قرآن سمجھ میں نہیں آتا یا اصل بات یہ ہے کہ ہم اسے سمجھنا چاہتے ہی نہیں؟؟

بغیر اپنا وقت لگائے' اپنی توانائی صَرف کئے' اپنی توانائی کو بروئے کار لائے تو کوئی کھیل تک سمجھ نہیں آتا۔ ہم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ ہم ورثے میں ملے رسمی عقیدے' سُنی سنائی باتوں اور فرقہ واریت ہی میں نہ پھنسے رہیں' بلکہ حقیقت تک پہنچنے کے لئے قرآن حکیم کا بذات خود مطالعہ شروع کریں۔ اس ضمن میں ہماری رہنمائی کے لئے مستند تفاسیر موجود ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ نے صاف فرما دیا ہے:

"ہم نے اِس قرآن کو یاددہانی اور نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنا دیا ہے، تو ہے کوئی اس سے نصیحت حاصل کرنے والا؟"

سورۃ القمر میں بار بار اللہ تعالیٰ انسان سے مخاطب ہو کر یہ فرما رہے ہیں۔ اب ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ قرآن کو آسان بنایا گیا ہے اور دوسری طرف سنی سنائی باتیں ہیں کہ قرآن سمجھ میں نہیں آ سکتا' ہمیں غور کرنا ہے کہ ہم کس کی بات کو سچ سمجھیں۔ اللہ کی بات کو یا اُن انسانوں کی بات کو جنہوں نے عموماً خود بھی اپنا وقت' توانائی اور ذہانت قرآن حکیم کو سمجھنے کے لئے لگانے کی زحمت گوارا نہیں کی ہوتی۔ یعنی یہ اعتراض کہ قرآن سمجھ میں نہیں آتا' اُن کا Personal Experience نہیں بلکہ انہوں نے بھی یہ باتیں کسی اور سے سُنی ہوتی ہیں۔

"ہم نے لوگوں کو سمجھانے کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کا مضمون طرح طرح سے بیان کر دیا ہے لیکن پھر بھی اکثر لوگ انکار پر قائم ہیں۔"

(سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۸۹' سورۂ کہف ۱۸۔ آیت ۵۴)

قرآن کے سٹوڈنٹ کو بارہا قرآن میں ایسی آیات ملیں گی جن سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ نے تو ہر چیز کھول کھول کر بیان کر دی ہے تاکہ آخرت میں انسان کوئی عذر (excuse) پیش نہ کر سکے۔ اگر اب بھی ہم اپنے انکار پر قائم رہیں جس کی اصل وجہ تو ہماری خواہشاتِ نفس ہیں' کمرِ ہمت باندھ کر اللہ تعالیٰ کے پیغام کو سمجھنے کی کوشش نہ کریں تو یہ خود کو دھوکہ دینے کے مترادف ہوگا اور اس کا نقصان کسی اور کو نہیں بلکہ خود ہمیں ہی ہوگا۔

"جو شخص ہدایت کی راہ پر چلتا ہے اپنے ہی لئے چلتا ہے اور جو شخص بے راہی اختیار کرتا ہے اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔ اور کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔" (سورۂ بنی اسرائیل - آیت ۱۵)

"یہ قرآن تو صرف یاددہانی ہے تمام جہانوں کے لئے۔" (سورۂ یوسف - آیت ۱۰۴)

"اللہ کی طرف سے روشنی آگئی ہے اور ایسی حق نما کتاب جس کے ذریعے اللہ اُن لوگوں کو جو اُس کی رضا کے طالب ہیں' سلامتی کے طریقے بتاتا ہے۔"

(سورۃ المائدہ - آیات ۱۶۔ ۱۵)

اب بھلا اِس کتاب کو سمجھے بغیر ہمیں سلامتی کے طریقے کیسے معلوم ہو سکتے ہیں حالانکہ اندھیروں کو دُور کرنے والی قرآن کی ٹارچ ہمارے پاس موجود ہے اگر ہم نے اِسے صرف

غلافوں میں سجا کر رکھے رکھا تو ظاہر ہے ہم بھی اس کے نور سے محروم ٹھوکریں کھاتے رہیں گے اور ہمارے ساتھ ساتھ وہ بھی جنہیں یہ ٹارچ ورثے میں ملی ہی نہیں۔ بلکہ ان کی گمراہی کی ذمہ داری ہم پر ہوگی۔

ہم میں سے بیشتر کا تصوّر یہ ہوگیا ہے کہ ہم بحیثیتِ امّت بخشے بخشائے تو ہیں ہی' نماز روزے کی پابندی اگر ہوگئی تو کیا کہنے' مزید درجات بلند ہوں گے۔ اس سے آگے اپنا وقت' اپنی توانائیاں اور اپنی ذہانت کو بروئے کار لا کر قرآن حکیم پر غور و فکر کو ضروری نہیں سمجھا جاتا بلکہ اسے انتہا پسندی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہماری طرح یہودیوں میں بھی یہ تصوّر عام تھا کہ چونکہ ہم پیغمبروں کی اولاد اور امّت میں سے ہیں للذا ہمیں جہنم کی آگ چھو ہی نہیں سکتی۔ یہ سوچ نہ صرف قرآنی تعلیمات کے بالکل خلاف ہے بلکہ منطقی طور پر بھی صحیح نہیں ہو سکتی کیونکہ کوئی بھی انسان اپنی choice سے مسلمان' یہودی' عیسائی یا ہندو کے گھر پیدا نہیں ہوتا۔ چونکہ پیدائش میں اُس کی اپنی کوئی Contribution یا Effort نہیں لہذا منطقی طور پر کوئی محض پیدائش کی بنیاد پر سزا یا انعام کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

> "وہ کہتے ہیں کہ دوزخ کی آگ ہمیں ہرگز چھونے والی نہیں' ہاں چند دنوں کی سزا اگر مل جائے تو مل جائے۔ ان سے پوچھئے کیا اللہ سے تم نے کوئی عہد لیا ہوا ہے جس کی وہ خلاف ورزی نہیں کر سکتا؟ بات یہ ہے کہ تم اللہ کے ذمے ڈال کر ایسی باتیں کہہ دیتے ہو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے کہ اس نے اُن کا ذمہ لیا ہے۔ سو جو بھی بدی کمائے گا اور اپنی خطاکاری میں پڑا رہے گا وہ جہنمی ہے اور جہنّم میں ہمیشہ رہے گا۔" (سورۃ البقرہ - آیات ۸۱-۸۰)

چنانچہ اس فرمانِ الٰہی سے واضح ہو جاتا ہے کہ کوئی انسان بھی پیدائشی طور پر بخشا بخشایا نہیں ہے' یہ تصوّر قرآن مجید میں کثرت سے discuss کیا گیا ہے اور اِس موضوع پر آیات قرآن حکیم میں بار بار آئی ہیں۔ اس کے علاوہ صرف کھوکھلے عقیدے یا محض کلمہ پڑھ لینے کی بنیاد پر بخشے بخشائے ہونے کی نفی بھی اللہ تعالیٰ نے بارہا قرآن میں کی ہے۔ مثلاً :

> "اے لوگو جو ایمان لائے ہو بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اُس آگ

سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔" (تحریم - آیت ۶)

غور کیجئے! خطاب ایمان والوں سے ہو رہا ہے یعنی وہ لوگ جو کلمہ پڑھ چکے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو آگ سے بچائیں۔ پس صرف کلمہ پڑھ لینے سے آگ سے چھٹکارا نہیں ہو سکتا۔ ایک اور جگہ فرمایا :

" اے ایمان والو اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لئے کیا سامان تیار کر رکھا ہے۔" (الحشر - آیت ۱۸)

ایمان کوئی ٹائٹل یا لیبل نہیں بلکہ state of mind ہے اور اس کو پرکھنے یا Judge کرنے والا کوئی انسان نہیں بلکہ وہ ہستی ہے جس سے دل کا کوئی بھید چھپا نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا خالی لیبل لگا لینے سے ہماری اپنی Satisfaction (تسلّی) تو شاید ہو جائے مگر اگر ہماری state of mind تبدیل نہیں ہوتی یعنی ہمارا ذہن اللہ کے سامنے Submission نہیں کرتا تو ممکن ہے یہ نمبر ۲ کا لیبل اللہ کے ہاں ہمیں بجائے فائدے کے نقصان دے جائے۔ جیسا کہ نمبر ۲ یعنی جعلی مال بنانے والوں کو سزا ملتی ہے' بشرطیکہ وہ پکڑے جائیں اور پکڑنے والا انہیں رشوت لے کر چھوڑ نہ دے یا کوئی تگڑی سفارش اسے بچا نہ لے۔

"اور ڈرو اُس دن سے جس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے کام نہ آ سکے گی" (البقرہ ۲ - آیت ۴۸)

بہرحال سورۃ العصر میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں واضح طور پر Warn کر دیا ہے کہ اگر ہم اس کے عذاب سے حتمی طور پر بچنا چاہتے ہیں تو کم از کم Qualification یہ حاصل کرنی پڑے گی۔

" زمانے کی قسم ہے سب انسان گھاٹے یا خسارے میں ہیں سوائے ان کے جو ایمان لائے اور پھر نیک اعمال کئے اور پھر انہوں نے دینِ حق کو Propagate کیا یعنی اس کی تبلیغ کی' اسے دوسروں تک پہنچایا اور پھر جو اس راہ میں مصیبتیں آئیں تو اُن پر خود بھی صبر کیا اور دوسروں کو بھی صبر کی تلقین کی۔" (العصر)

اب ظاہر ہے انسان خود کیا عمل کرے گا اگر اسے پتہ ہی نہ ہو کہ کیا کرنا ہے اور پھر

دوسروں تک کیا پہنچائے گا اگر وہ خود ہی نہ سمجھ پایا ہو۔ یہ ہے کم سے کم معیار اللہ تعالیٰ کے نزدیک خسارے یعنی عذاب سے بچنے کا۔ اگر ہم ان شرطوں کو سخت بھی سمجھتے ہیں تب بھی ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ نہ تو ہمارے پاس کوئی اور Choice ہے اور نہ ہی اس دنیاوی زندگی کے بعد کوئی دوسرا Chance۔ "تم اپنے رب کا حکم مان لو اس سے پہلے کہ ایسا دن آ پہنچے جس سے واپسی ممکن نہیں"۔ (الشوریٰ: ۴۷)

ایک خطرناک تصوّر جس میں خود انسان کا نفس یعنی خواہشات اُسے مبتلا رکھتی ہیں' وہ اللہ کی رحمت پر بھروسہ کر کے نافرمانی اور مسلسل گناہ کئے جانا ہے۔ جی' اللہ بڑا رحیم اور کریم ہے' وہ نکتہ نواز ہے' ہمیں سزا دے کر اُسے کیا کرنا ہے۔ وہ جسے چاہے معاف کر دے اور چونکہ اللہ تعالیٰ کو Absolute Authority حاصل ہے لہٰذا کسی بندے کا کوئی حق نہیں کہ اُس سے سین جیم کرے کہ اُس نے خود ہی یہ اُصول و ضوابط اپنے اوپر لازم کیوں کر لئے ہیں!

ویسے تو یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ وہ جسے چاہے معاف کر سکتا ہے مگر اُس کی یہ Absolute Authority بلا حکمت استعمال نہیں ہوتی بلکہ عدل و انصاف کے ساتھ استعمال ہوتی ہے۔ جہاں وہ رحیم و کریم ہے وہاں عادل بھی تو ہے' بدلہ دینے والا بھی تو ہے' مُنصف بھی تو ہے' لہٰذا انصاف کرنا اس نے خود ہی اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ کیا وہ اپنے مجرموں اور وفاداروں کو برابر کر دے گا۔ اور اپنے یہ اُصول و ضوابط اس نے Secret نہیں رکھے بلکہ ایک ضخیم کتاب میں کھول کھول کر بیان کر دیئے ہیں' سو اب بھی ہم غلط امیدیں وابستہ کئے رکھیں تو نقصان ہمارا اپنا ہی ہوگا کسی اور کا نہیں۔

"اے انسانو یقینی طور پر اللہ کا وعدہ سچّا ہے' سو کہیں تمہیں یہ دنیاوی زندگی دھوکے میں نہ ڈال دے"۔ (سورۃ فاطر ۳۵ - آیت ۵)

"بے شک اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے لاعلم ہیں!" (سورۃ الروم ۳۰ - آیت ۶) اور

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرتے رہو اور تم میں سے ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لئے کیا سامان کیا ہے!" (سورۃ الحشر ۵۹ - آیت ۱۸)

اللہ کی رحمت پر بھروسہ کر کے نافرمانی کئے جانے کی اہمیت اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنی

ہے کہ پوری ایک سورت یعنی سورۃ الانفطار اس تصوّر کی تردید کے لئے اللہ نے اتاری ہے تاکہ انسان اپنے آپ کو تسلیاں ہی نہ دیتا رہ جائے' اور خود کو دھوکے میں مبتلا نہ کئے رکھے۔ اگر اُس نے نافرمانی ہی کرتے رہنا ہے تو پوری طرح سوچ سمجھ کر کرے کہ اللہ نے اُس کا انجام پہلے ہی اُسے بتلا دیا ہے۔

سورۃ التکاثر میں اللہ تعالیٰ نے ان انسانوں کو تنبیہہ کی ہے جنہوں نے ساری زندگی اسی جدوجہد میں گزار دی کہ وہ دولت' بینک بیلنس کے اعتبار سے دوسروں سے آگے نکل جائیں' معیارِ زندگی کی Race میں وہ سب کو پیچھے چھوڑ دیں اور اِسی چکر میں اُن کی ساری زندگی گزر گئی' وہ کبھی سوچ ہی نہ سکے کہ اس زندگی کے آگے ایک یقینی Stage سزا اور انعام کی آئے گی' جب پوچھا جائے گا کہ اللہ نے جو قوتیں' صلاحیتیں' نعمتیں' ذہانت اور وقت اُن کو دیا تھا' اُس کا کتنا حصّہ اپنے بخشنے والے کی خوشنُودی کے لئے صَرف کیا اور کتنا اُس سے' اُس کے پیغام سے لاپروا ہو کر صِرف اور صِرف اپنے نفس کی خواہشات پوری کرنے کے لئے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ نے ہماری اِس زندگی کو آزمائش اور امتحان بنایا ہے لہٰذا وہ زبردستی انسانوں کو صحیح راستے کی طرف نہیں موڑتا وگرنہ امتحان اور آزمائش کا Concept ہی ختم ہو جائے۔ پیغام اور پیغامبر کی ضرورت ہی نہ رہے۔ زندگی اور موت کا چکر یعنی نہ صرف یہ Life cycle بے معنی ہو جائے بلکہ پوری کائنات یعنی Universe کی تخلیق ہی بے مقصد ہو جائے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انسان کو ارادے اور انتخاب کی آزادی دے رکھی ہے۔ خیر و شر کی پہچان کی صلاحیت ہمارے اندر رکھ دی ہے۔ اب ہم اگر اس صلاحیت سے کام نہ لیں اور اسے ضائع کر کے اندھے اور بہرے بن جائیں تو اللہ ہمیں زبردستی ہدایت کی طرف نہیں لائے گا وگرنہ سزا و جزا کا تصوّر ہی بے معنی ہو جائے۔ ایک مزید خیال جس میں ہمارا نفس ہمیں مبتلا رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں دولت دی ہے' جاہ و جلال دیا ہے' اقتدار بخشا ہے لہٰذا اللہ کی نظرِ کرم ہم پر ہے یعنی وہ ہم سے خوش ہے' تو اگر وہ یہاں ہم سے خوش ہے تو آخرت میں خواہ مخواہ ناراض کیوں ہو جائے گا۔ لہٰذا ہمیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں' فکر وہ کریں جن پر اللہ نے اپنی نظرِ کرم نہ کر رکھی ہو۔ اس تصوّر کی نفی میں اللہ تعالیٰ نے فرما دیا :

'' اور یہ دنیا کی زندگی سوائے دھوکے کے سامان کے اور کچھ بھی نہیں ''۔ (الحدید۔ آیت ۲۰)
اس کے علاوہ سورۃ الکہف اور سورۃ المدثر میں فرمایا کہ ایسے لوگوں کو میں آخرت میں بڑی شدید چڑھائی چڑھاؤں گا کیونکہ وہ میری دی ہوئی نعمتوں کی آڑ لے کر آخرت کی سزا اور جزا جھٹلایا کرتے تھے حالانکہ یہ دنیا تو میں نے بنائی ہی آزمائش کے لئے ہے' کسی کو میں دے کر آزماتا ہوں اور کسی کو نہ دے کر۔ دنیا کا اقتدار' جاہ و جلال اور مال و دولت کی میرے نزدیک ایک ذرّے کے برابر بھی اہمیت نہیں اور نہ ہی یہ کامیابی کا معیار ہیں۔ کامیاب تو اصل میں وہ ہے جو آخرت میں کامیاب قرار دیا گیا۔

حاصلِ کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر دونوں راستے ہمیں سمجھا دیئے ہیں۔ چاہیں تو ہم قرآن حکیم کو اپنا گائیڈ بنا کر اور اس دنیا کو اپنا دائمی اور حقیقی گھر نہیں بلکہ امتحان گاہ اور Place of duty سمجھ کر زندگی بسر کریں یا قرآن حکیم سے لاپرواہی کی روش اپنائے رکھیں' سنی سنائی باتوں اور غلط تصوّرات میں گُم ہو کر اپنے آپ کو دھوکہ دیئے رکھیں اور اسی کیفیت میں زندگی گزار دیں۔

سورۃ الحدید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

'' کیا ایمان والوں کے لئے ابھی وقت نہیں آیا کہ اُن کے دل اللہ کے ذکر سے پگھلیں اور وہ اس کے نازل کردہ حق یعنی قرآن کے سامنے جھک جائیں۔ اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں پہلے کتاب دی گئی تھی پھر ایک لمبی مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہوگئے اور آج ان میں سے اکثر فاسق بنے ہوئے ہیں ''۔ (الحدید - آیت ۱۶)

* * *

بقیہ : ریفریشر کورس

لئے بغیر فیس انگریزی زبان کی کلاسیں جاری کر کے انہیں جدید رو میں لانے کا اہتمام کریں گے۔ آخر میں پروفیسر صاحب نے قرآن کالج کے اساتذہ کے ساتھ ارتباط کو جاری رکھنے کی خواہش کا اظہار کیا اور اس ضمن میں دو طرفہ تعاون کے لئے یہ تجویز پیش کی کہ ادارہ تعلیم و تحقیق کی مطالعاتی سہولتیں کالج کے اساتذہ کے لئے حاصل رہیں گی اور ہم اپنے طلبہ کے استفادے کے لئے قرآن کالج کے اساتذہ کو بھی لیکچر کی زحمت دیا کریں گے۔

سلسلہ وار درسِ قرآن کے دُوسرے دَور کے آغاز پر شائع شدہ ہینڈ بل کا عکس

”لوگو! آگئی ہے تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے نصیحت اور دلوں کے روگوں کی دوا، اور اہلِ ایمان کے حق میں ہدایت و رحمت“ ——— (سورۃ یونس، آیت ۵۷)

اَلحَمدُ لِلّٰہ

کہ مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کے صدر مؤسس

ڈاکٹر اسرار احمد

کے

سِلسلہ وار درسِ قرآن

کا ایک دَور ہفتہ ۹ نومبر ۱۹۹۱ء کو مکمل ہوگیا اور اب دوسرے دَور کا آغاز ہو رہا ہے جس کی تمہید کے طور پر ان شاء اللہ العزیز

۱۶ اور ۱۷ نومبر بروز ہفتہ و اتوار شام کو چھ بجے

قرآن آڈیٹوریم

اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن لاہور میں ڈاکٹر صاحب کے

تعارفِ قرآن حکیم

کے موضوع پر دو خطاب ہوں گے جن میں قرآن کا اصل موضوع، اس کا مجموعی اسلوب، ترکیب، ترتیب، جمع و تدوین، اور اصولِ تفسیر و تاویل ایسے اہم مضامین بیان ہوں گے۔

اور پھر ان شاء اللہ ہفتہ ۲۳ نومبر سے سورۂ فاتحہ کا درس شروع ہو جائے گا

شمع قرآنی کے پروانوں کو شرکت کی عام دعوت ہے!

(نوٹ: خواتین کی شرکت کے لیے بھی مناسب اہتمام موجود ہے۔)

سورۃ البقرۃ (۲۰)

(آیات: ۲۸، ۲۹)

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی اور ترتیبی (اقسام) نمبر اختیار کیے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحث (اللغۃ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ بحث کو ظاہر کرتا ہے یعنی علی الترتیب اللغۃ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳ اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲:۵:۱(۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲:۵:۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲:۲۰ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا
فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ
اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۲۸ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا
فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۚ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَاۗءِ
فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ
عَلِيْمٌ ۝۲۹

۲ : ۲۰ : ۱ اللغة

۲ : ۲۰ : ۱ (۱) [کَیْفَ] یہ اسماءِ استفہام میں سے ایک اسم ہے جس کا اردو ترجمہ "کیسے ؟ ، کیسا ؟ کیوں کر ؟ ، کس طرح ؟" سے کیا جاتا ہے ۔ اس کا مادہ " ک ی ف " اور وزن " فَعْلَ " ہے (یعنی اس کے آخر پر تنوین نہیں آتی بلکہ یہ ہمیشہ فتحہ (ـَ) پر مبنی ہوتا ہے) ۔ عربی زبان میں اس مادہ سے ایک فعل ثلاثی مجرد "کاف ..... یکِیفُ کیفًا (باب ضرب سے) آتا ہے اور اس کے معنی "..... کو کاٹ دینا" ہوتے ہیں اور مزید فیہ کے ایک دو ابواب سے بھی فعل آتے ہیں ۔ اور اس مادہ سے بعض جدید فنی اصطلاحات کے لیے بھی فعل بنا لیے گئے ہیں۔ مثلاً "کَیَّفَ اور تکَیَّفَ " بمعنی "ائر کنڈیشن کرنا اور ہونا "۔ اسی مادہ سے ماخوذ لفظ "کیفیت " اردو میں مستعمل ہے ۔ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ سے کسی قسم کا کوئی فعل استعمال نہیں ہوا ۔

● بعض دوسرے اسماءِ استفہام کی طرح "کیفَ " کے استعمال کے بارے میں چند باتیں قابل ذکر ہیں ۔

(۱) یہ لفظ عموماً تو استفہام (کچھ دریافت کرنا) کے لیے آتا ہے اور بطور استفہام بھی کبھی تو صرف " حال دریافت کرنے " کے لیے آتا ہے جیسے "کیفَ انت ؟ (تیرا کیا حال ہے)" اس صورت میں اسے استفہامِ حقیقی کہتے ہیں ۔ اور کبھی یہ لفظ اظہارِ تعجب کے لیے آتا ہے جیسے اسی زیر مطالعہ آیت میں ہے (گویا یہ "کتنی عجیب بات ہے کہ" کے معنی میں ہے) ، اور کبھی یہ (کیفَ) دراصل نفی یا انکار کے لیے آتا ہے جیسے "کیف یکون للمشرکین عھدٌ" (التوبۃ : ۷) میں (بمعنی کیوں کر : یعنی " نہیں ") ہے اور کبھی یہ (اسم استفہام) دراصل توبیخ یعنی جھڑک دینے کے لیے آتا ہے جیسے " انظر کیف ضربوا لک الامثال (الفرقان : ۹) میں ہے ۔

(۲) کبھی یہ (کیف) اسم شرط کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے مگر شرط اور جوابِ شرط کا فعل لفظ اور معنی کے لحاظ سے ایک ہی ہوتا ہے اور اس میں کوئی فعل مجزوم نہیں ہوتا۔ اس صورت میں اس کا ترجمہ "جیسا..... ویسا" کی طرح کیا جاتا ہے مثلاً "کیفَ تصنعُ اصنعُ" (تو جیسا کرے گا میں ویسا ہی کروں گا)۔ اس میں دو مختلف فعل استعمال نہیں ہو سکتے مثلاً "کیفَ تکتبُ اقرءُ" کہنا بالکل غلط ہے۔ اگر "کیف" کے ساتھ "مَا" بھی لگا ہو یعنی "کیفما" استعمال کریں تو پھر یہ ایسے اسم شرط کا کام دیتا ہے جس میں شرط اور جوابِ شرط کے فعل مجزوم ہوں گے۔ مثلاً "کیفما تصنعْ اصنعْ" ــــ قرآن کریم میں "کیفما" کہیں استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ "کیفَ" بھی اسم شرط کے طور پر کہیں نہیں آیا۔

● یہ وضاحت تو "کیفَ" کے لغوی معنی (حسبِ موقع) کے لحاظ سے ہے۔ بلحاظِ اعراب "کیفَ" کبھی خبر کے طور پر آتا ہے، کبھی حال کے طور پر اور کبھی مفعول (ثانی یا مطلق) کے طور پر آتا ہے۔ اس کا بیان ابھی آگے "الاعراب" میں آئے گا۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔ لفظ "کیفَ" قرآن کریم میں ۸۳ جگہ وارد ہوا ہے اور مذکورہ بالا تمام معانی (استفہام، تعجب، انکار اور توبیخ) کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ہر جگہ اس کے معنی کا تعین سیاق و سباقِ عبارت سے ہو سکتا ہے۔

[تَكْفُرُوْنَ] کا مادہ "ک ف ر" اور وزن "تَفْعُلُوْنَ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد کے معنی و استعمال پر البقرہ : ۶ میں بات ہو چکی ہے دیکھئے ۲:۵:۱(۱)۔ یہاں بھی یہ اسی فعل مجرد (کفَرَ یکفُر) سے فعل مضارع کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ جس کا ترجمہ "تم کفر کرتے ہو، کفر کر سکتے ہو، کافر ہوتے ہو، انکار کر سکتے ہو، منکر ہو سکتے ہو، منکر ہو گے، ناسپاسی (ناشکری) کرتے ہو، نہیں مانتے ہو" سے کیا گیا ہے گویا "کفر" کے معنی "انکار"، ناشکری اور نہ ماننا" بھی ہیں۔ یہ صیغۂ فعل (تکفرون) مختلف صورتوں (مرفوع، منصوب، مجزوم) میں قرآن کریم کے اندر ۱۹ جگہ استعمال ہوا ہے۔

[بِاللّٰهِ] فعل "کفر" کے باء (بِ) کے صلہ کے ساتھ استعمال اور اس کے معنی پر ۲:۵:۱(۱) میں بات ہو چکی ہے ۔ اس لیے یہاں " بِ " کی وجہ سے (کفر) " باللہ " کا (مصدری) ترجمہ " اللہ سے کفر کرنا، ..... کا منکر ہونا، ..... کی ناسپاسی کرنا، ..... کو نہ ماننا، ..... کا انکار کرنا " کے ساتھ ہوگا. یعنی اوپر " تکفرون " صیغہ مضارع کے جو معنی مذکور ہوئے ہیں ان سے پہلے اسم جلالت " (اللہ) سے، کا، کی، کو " لگا دینے سے " تکفرون باللہ " کا مکمل ترجمہ سامنے آجاتا ہے ۔

[وَ] " وَ " کے مختلف معنی پر ۱:۴:۱ (۳) میں بات ہو چکی ہے۔ یہاں (زیر مطالعہ آیت میں) " واو " کو حالیہ سمجھتے ہوئے اس کا ترجمہ " درانحالیکہ، حالانکہ، تمہارا حال یہ ہے کہ اور جس حال میں کہ " سے کیا گیا ہے ۔ بعض نے " اور " سے بھی ترجمہ کر دیا ہے (جو اردو میں حالیہ اور مستانفہ واو کے لیے مستعمل ہے) ان سب میں سے سلیس اور بامحاورہ ترجمہ غالباً " حالانکہ " ہے ۔ " درانحالیکہ " میں فارسیت زیادہ ہے اور باقی تراجم میں قدیم زبان یا محض لفظی ترجمہ کا عنصر زیادہ ہے۔

[كُنْتُمْ] کا مادہ " ک و ن " اور وزن اصلی " فَعَلْتُمْ " ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد کے معنی و استعمال اور خود اسی صیغہ " كُنْتُمْ " کی بناوٹ، اس کی تعلیل اور معنی وغیرہ پر البقرہ :۲۳ یعنی ۲:۱۷:۱(۱) کے ساتھ بات ہو چکی ہے ۔ اسی لیے " کنتم " کا ترجمہ " تم تھے " سے کیا جاتا ہے اور یہاں یہ بطور فعل ناقص استعمال ہوا ہے۔

۲:۲۰:۱(۲) [اَمْوَاتًا] کا مادہ " م و ت " اور وزن (یہاں) " اَفْعَالًا " ہے۔ (جو " امواتٌ " بروزن " افعالٌ " کی منصوب شکل ہے ۔ لفظ " اَمْوَات " جمع مکسر کا صیغہ ہے ۔ اس کا واحد " مَيْتٌ " اور " مَيِّتٌ " ہے جن کی جمع مکسر " اموات " کے علاوہ " مَوْتیٰ " بھی آتی ہے ۔ اور اس کی جمع مذکر سالم (صرف عاقل مخلوق کے لیے) " مَيِّتُوْنَ " اور " مَيْتُوْنَ " بھی آتی ہے ۔ البتہ مؤخرالذکر

جمع (مَیتُون) قرآن کریم میں مستعمل نہیں ہوئی ۔ باقی تینوں صورتیں (اموات، مَوتیٰ اور مَیِّتون) استعمال ہوئی ہیں ۔

● اس مادہ (م و ت) سے فعل ثلاثی مجرد "مَات یَمُوت (دراصل مَوَتَ یَمُوْتُ) مَوْتًا" زیادہ تر باب "نصر" سے آتا ہے۔ اور کبھی "ماتَ یماتُ (دراصل مَوِت یَمْوَتُ) مَوتًا" (باب سَمِعَ سے) بھی آتا ہے ۔ اور یہ اجوف یائی کے طور پر (م ی ت) مادہ سے بھی "ماتَ یَمِیْتُ مَیْتًا" بھی استعمال ہوتا ہے ۔ سب (ابواب) سے اس فعل کے بنیادی معنی "مرنا، مرجانا، روح کا جسم سے جدا ہونا یا ہو جانا" ہیں ۔ پھر اس کے فاعل کے طور پر ذکر ہونے والی چیز (مثلاً: الطریق یا النار یا الارضُ وغیرہ) کے مطابق اس فعل میں متعدد مجازی اور محاوراتی معنی پیدا ہوتے ہیں ۔ اس فعل (مَاتَ) کا استعمال انسان، حیوان، نباتات سب پر ہوتا ہے ۔

● قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے افعال کے مختلف صیغے ۳۹ جگہ آئے ہیں، جن میں سے ۹ جگہ تو صیغہ فعل ماضی کا ہے جسے مندرجہ بالا تین ابواب میں سے کسی سے متعلق قرار دیا جا سکتا ہے ۔ ۱۲ جگہ ایسے صیغے آئے ہیں جو باب نصر سے ہی ہو سکتے ہیں اور باقی ۹ جگہوں پر ایسے صیغے بھی آئے ہیں جن کو باب "سَمِعَ یا ضرب" (دونوں) سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس مادہ (موت) سے مزید فیہ کے بابِ افعال کے مختلف صیغے بھی ۲۱ جگہ وارد ہوئے ہیں ۔

● کلمہ "اموات" جو قرآن کریم میں کل ۶ جگہ استعمال ہوا ہے، کا واحد (میّت یا مَیْتٌ) اسم الفاعل (مائت : مرجانے والا) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اس کا ترجمہ "مردہ، بے جان، بے روح" کیا جا سکتا ہے ۔ پھر یہ لفظ حقیقی اور مجازی دونوں معنی کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ اس لیے کسی عبارت میں ان کے معنیٔ مراد کا تعیّن اصولِ تفسیر کی مدد سے یا مستند تفسیر کے حوالے سے ہی کیا جا سکتا ہے ۔ ویسے اس بارے میں "اصول" یہ ہے کہ کسی بھی عبارت میں بنیادی طور پر کسی

لفظ کے "حقیقی" معنی ہی مراد ہوں گے اِلّا یہ کہ کوئی ایسا قرینہ پایا جائے جو مجازی یا استعارہ والے معنی مراد لینا ضروری قرار دے۔ اور اس "قرینہ" کے تعیّن کے لیے کسی کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔

۲:۲۰:۱(۳) [فَاَحْیَاکُمْ] اس کی ابتدائی "فاء" (فَ) تو عاطفہ بمعنی "پس" یا "پھر" ہے۔ آخری ضمیر منصوب (کُمْ) کے معنی یہاں "تم کو یا تمہیں" ہیں۔ اور اس "فَ" اور "کُمْ" کے درمیان فعل "اَحْیَا" ہے جس کا مادہ "ح ی ی" اور وزن اصلی "اَفْعَلَ" ہے۔ اس کی اصلی شکل "اَحْیَیَ" تھی جس کی آخری متحرک "یاء" ماقبل مفتوح ہونے کے باعث "الف" میں بدل دی جاتی ہے۔ اصولی طور پر اس لفظ کی املاء "اَحْیٰی" (الف مقصورہ کے ساتھ) ہونی چاہیئے۔ مگر یہ لفظ خلافِ قیاس "احیا" ہی لکھا جاتا ہے۔ اس مادہ (ح ی ی) سے فعل مجرد کے استعمال اور معنی پر البقرہ: ۲۶ یعنی ۲:۱۹:۱(۱) میں بات ہو چکی ہے۔

● "اَحْیَا" اس مادہ (حیی) سے بابِ افعال کا فعل ماضی صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ اس باب سے فعل "اَحْیَا...... یُحْیِیْ" (دراصل اَحْیَیَ یُحْیِیُ) اِحْیَاءً کے بنیادی معنی ہیں: "......کو جِلانا، ......کو جاندار کرنا، ...... میں جان ڈالنا، ...... کو جان بخشنا، ...... کو زندگی دینا یا زندہ کرنا"۔ یعنی یہ فعل ہمیشہ متعدی اور مفعول بنفسہٖ کے ساتھ آتا ہے (بغیر صلہ کے) — اور اس کے فاعل اور مفعول کے طور پر مختلف اشیاء کے ذکر سے اس میں بھی مختلف محاوراتی معنی پیدا ہوتے ہیں (مثلاً احیا اللّیلَ = اس نے رات بھر عبادت کی) اس طرح "فَاَحْیَاکُمْ" کا ترجمہ "پھر اس نے تم کو جِلایا، زندگی دی، جان بخشی" وغیرہ (مندرجہ بالا مصدری معنی کے ساتھ) کیا جا سکتا ہے۔

یہ کلمہ (اَحْیَا) اور اس کے باب (افعال) سے مختلف صیغے قرآن کریم میں بچاس جگہ وارد ہوئے ہیں۔

۲:۲۰:۱(۴) [ثُمَّ] کا مادہ "ث م م" اور وزن "فُعْلَ" ہے۔ قرآن کریم میں اس مادہ سے کوئی فعل نہیں آیا۔ بلکہ صرف ایک دو حرف ہی آئے ہیں جن میں سے ایک یہ "ثم" ہے جو حرف عطف ہے اور بلحاظ معنی کسی کام یا حکم میں "ترتیب مع تراخی" (یعنی نمبروار ایک کے بعد دوسرے کا اور کچھ وقفہ سے واقع ہوتے) کا مفہوم دیتا ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ حسب موقع "پس، پھر، سو، اس کے بعد، دوبارہ، مزید برآں" کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ بعض دفعہ اس سے ترتیب زمانی مراد نہیں بھی ہوتی، بلکہ صرف تاکید اور زور دینے یا استیناف کے لیے آتا ہے۔ اس وقت اس کے اندر "پھر یہ بات بھی تو قابلِ ذکر ہے کہ......" کا مفہوم موجود ہوتا ہے، اگرچہ اردو میں عموماً اس قسم کے "ثُمَّ" کا ترجمہ بھی "پس یا پھر" سے کر دیتے ہیں۔ (اس کی ایک مثال الانعام ۱۵۴ میں ہے) کبھی یہ "باربار" بلکہ بطور محاورہ "سوبار، ہزار بار" کے معنی بھی دیتا ہے۔ جیسے "کَلَّا..... ثم کلّا....." (ہرگز نہیں..... سو بار ہرگز نہیں.....) قرآن کریم میں "ثُمَّ" کے یہ تمام استعمالات آئے ہیں۔ آیت زیر مطالعہ میں "ثُمَّ" ترتیب مع تراخی یعنی "پھر اس کے (کچھ عرصہ) بعد" کے معنی میں آیا ہے۔

۲:۲۰:۱(۵) [يُمِيتُكُمْ] کی آخری ضمیر منصوب (کُمْ) تو یہاں "تم کو یا تمہیں" کے معنی میں ہے اور فعل "يُمِيتُ" کا مادہ "م و ت" اور وزن اصلی "يُفْعِلُ" ہے جس کی اصلی شکل "يُمْوِتُ" تھی پھر حسب قاعدۂ تعلیل (یا عربوں کے استعمال کے مطابق) متحرک حرفِ علت (وِ) کی حرکتِ کسرہ (ـِ) اس کے ماقبل حرفِ صحیح (م) کو دے کر خود اس واو (و) کو اپنی ماقبل (نئی) حرکت (کسرہ) کے موافق حرف (ی) میں بدل دیا جاتا ہے۔ یعنی يُمْوِتُ = يُمِوْتُ = يُمِيتُ ہو جاتا ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد کے باب اور معنی وغیرہ کے بارے میں ابھی اوپر "امواتا" کے تحت ۲:۲۰:۱(۲) بات ہو چکی ہے۔

● لفظ "يُمِيتُ" اس مادہ (م و ت) سے باب افعال کا فعل مضارع واحد مذکر غائب ہے۔ اس باب سے فعل "اَمَاتَ..... يُمِيتُ إِمَاتَةً" (دراصل

اَموَت یُموِتُ اِمْواتًا) کے بنیادی معنی ہیں: "...... کو مردہ کرنا، ...... کو مار دینا، ...... کو موت دینا" پھر فاعل یا مفعول کے طور پر مختلف چیزوں کے ذکر سے اس میں بھی کئی محاوراتی معنی پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً اَمَاتَ فلانٌ غَضَبَہٗ (فلاں نے اپنا غصہ ٹھنڈا کر لیا۔ اس پر قابو پا لیا)

اس طرح "یُمِیتُکُمْ" کا ترجمہ "وہ تم کو مردہ کرے گا، وہ تم کو مار دیتا ہے، موت دے گا، مارتا ہے" کی صورت میں کیا جا سکتا ہے (فعل مضارع، حال اور مستقبل دونوں کا کام دیتا ہے)، قرآن کریم میں باب افعال کے اس فعل (اَمات) سے مختلف صیغے ۲۱ جگہ آئے ہیں۔ جس طرح لفظ حیات (زندگی) کے حقیقی اور مجازی متعدد معنی ہیں اسی طرح لفظ "موت" بھی متعدد حقیقی اور مجازی معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے[1]

[ثُمَّ یُحْیِیکُمْ] "ثُمَّ" (پھر، پس) اور "کُمْ" (ضمیر) کے معنی ابھی اوپر بیان ہوئے ہیں۔ ان کے درمیان فعل "یُحْیِی" ہے (جس کی آخری یاء (ی) "کُمْ" کے ساتھ ملا کر لکھی جاتی ہے) اس (یُحْیِی) کا مادہ "ح ی ی" اور وزن اصلی "یُفْعِلُ" ہے اس کی اصلی شکل "یُحْیِیُ" تھی جس میں ماقبل مکسور (ـیِ) ہونے کے باعث آخری "یاء" لکھنے اور بولنے میں ساکن کر دی جاتی ہے۔ اس کی عام عربی املاء "یُحْیِیْ" ہے۔ قرآنی املاء کا ذکر آگے بحث "الرسم" میں آئے گا۔

اس مادہ (ح ی ی) سے فعل مجرد پر ابھی اوپر "احیاکم" (۲ : ۲۰ : ۱ (۳)) میں بات ہو چکی ہے۔

زیرِ مطالعہ کلمہ "یُحْیِی" اپنے مادہ سے باب اِفعال کا فعل مضارع صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ باب افعال کے اس فعل (اَحیٰ یُحْیِی) پر بھی ابھی اوپر ۲ : ۲۰ : ۱ (۳) میں بات ہوئی ہے۔ اس طرح "ثُمَّ یُحْیِیکُمْ" کا ترجمہ "پھر وہ تم کو زندہ کرے گا،

---

[1] چاہیں تو تفصیل کے لیے دیکھئے المفردات (للراغب) تحت مادہ ح ی ی اور م و ت۔ جہاں حیات اور موت (ہر ایک) کی پانچ چھ "اقسام" یا معنیٔ مراد (ممکن) کا ذکر کیا گیا ہے۔

جلائے گا" ہے۔

[ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ] اس کی سیدھی سادی نثر تو "ثُمَّ تُرْجَعُوْنَ اِلَیْہِ" ہے۔ پھر "فاصلہ" (شعر کے آخری لفظ کو قافیہ اور قرآنی عبارت میں خاتمۂ آیت کو "فاصلہ" کہتے ہیں) کی رعایت سے "تُرْجَعُوْن" کو آخر پر لایا گیا ہے۔ "ثُمَّ" کا ترجمہ "پھر، پس، اس کے بعد، دوبارہ" ہو سکتا ہے اور "الیہ" میں "اِلی" جارّہ بمعنی "کی طرف" اور "ہ" ضمیر مجرور بمعنی "اس" ہے۔ یوں اِلَیْہِ = "اس کی طرف۔ اس کی جانب یا اس کے پاس ـــــ ہے۔

"تُرْجَعُوْنَ" کا مادہ "ر ج ع" اور وزن "تُفْعَلُوْنَ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد (رَجَعَ یَرْجِعُ) کے معنی (لوٹنا، لوٹانا) اور اس کے لازم اور متعدی استعمال پر اس سے پہلے البقرہ : ۱۸ یعنی ۲ : ۱۳ : ۱ (۱۵) میں بات گزر چکی ہے۔

● آیت زیر مطالعہ میں کلمہ "تُرْجَعُوْن" فعل رَجَعَ یَرْجِعُ مَرْجِعًا کے بطور فعل متعدی بمعنی "لوٹانا، واپس بھیجنا، پھیر دینا" سے فعل مضارع مجہول کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ اس لیے اس کا ترجمہ اکثر نے "تم پھیرے جاؤ گے، لوٹائے جاؤ گے، واپس کیے یا لے جائے جاؤ گے" سے یعنی فعل مجہول کے ساتھ ہی ترجمہ کیا ہے۔ بعض نے "پلٹ کر جاؤ گے" اور بعض نے "تم کو (اس کے پاس) جانا ہے" سے ترجمہ کیا ہے جو مفہوم کے لحاظ سے درست ہے مگر اصل الفاظ (متن) سے ذرا ہٹ کر ہے۔ کیونکہ ایک (پہلے) میں ترجمہ فعل لازم کی طرح کیا گیا ہے اور دوسرے میں ترجمہ "مصدر" کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اور مضارع کو مصدر بنانے کے لیے کوئی "عامل" (مَا یا اَن وغیرہ) درکار ہوتا ہے جو یہاں نہیں ہے۔

[ھُوَ الَّذِیْ] "ھُوَ" ضمیر مرفوع منفصل (برائے واحد مذکر غائب ہے جس کا ترجمہ "وُہ" ہے اور "الذی" اسم موصول برائے واحد مذکر بمعنی

"جس نے" ہے۔ اس طرح "ھو الذی" کا لفظی ترجمہ تو بنتا ہے "وہ جس نے کہ" مگر ھُوَ اور "الذی" کے اکٹھا ہو جانے کی وجہ سے (کیونکہ ویسے تو یہاں صرف "الذی" بھی کام دے سکتا تھا) اب اس ترکیب میں ایک زور پیدا ہو جاتا ہے جس کو اردو میں "ہی" کے استعمال سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس طرح "ھو الذی" کا بامحاورہ ترجمہ "وہی ہے جس نے کہ....." یا "وہی تو ہے جس نے ....." سے کیا جاتا ہے۔

۲: ۲۰: ۱ (۶) [خَلَقَ] کا مادہ "خ ل ق" اور وزن "فَعَلَ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد (خَلَقَ یَخلُقُ) کے بنیادی معنی "چمڑے کو کاٹنے سے پہلے صورت شکل ناپ وغیرہ کا اندازہ کرنا" ہیں۔ پھر اس سے اس میں "پیدا کرنا" اور "بنانا" کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ عربی زبان میں یہ فعل نصر کے علاوہ بعض دوسرے ابواب (سمع اور کرُم) سے بھی مختلف معنی (مثلاً بوسیدہ ہونا، نرم ہونا) کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے تاہم قرآن کریم میں یہ صرف باب نصر سے اور "پیدا کرنا یا بنانا" والے معنی کے لیے ہی استعمال ہوا ہے۔ اس مادہ سے فعل (خلق) کے باب، معنی اور استعمال کے لیے مزید دیکھئے ۲: ۱۶: ۱ (۳)۔

[لَکُمْ] جو لام الجر (لِ) بمعنیٔ "کے لیے" اور "کُمْ" بمعنیٔ تمہارا/تمہارے کا مرکب ہے۔ لام الجر کے مختلف معنی و مفہوم کو مدنظر رکھتے ہوئے دیکھئے الفاتحہ: ۲ یعنی ۱: ۲: ۱ (۴)) بعض اردو مترجمین نے "لَکُمْ" کا وضاحتی ترجمہ صرف "تمہارے لیے" کی بجائے "تمہارے فائدے کے لیے" کیا ہے۔

[مَا فِی الْاَرْضِ] یہ "مَا" (موصولہ بمعنی "جو کچھ کہ، جو کچھ بھی کہ اور سب کچھ جو" ہے) + "فِیْ" (حرف الجر بمعنی "میں") + الارض (بمعنیٔ "زمین") کا مرکب ہے۔ [ضرورت ہو تو "ما" کے معانی کے لیے ۲: ۲: ۱ (۵) اور ۲: ۱۹: ۱ (۲)۔ "فِیْ" کے لیے ۲: ۱: ۱ (۵) اور "الارض" پر بحث کے لیے ۲: ۹: ۱ (۴) پر نظر ڈال لیجئے]۔

۲ : ۲۰ : ۱ (۷) [جَمِیۡعًا] کا مادہ " ج م ع " اور وزن " فَعِیۡلًا " بصورت منصوب ہے (جس کے یہاں منصوب ہونے کی وجہ آگے " الاعراب " میں بیان ہوگی ۔)

اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد " جمَع ... یجمَع جمعًا " (باب فتح سے) آتا ہے اور اس کے معنی ہیں : ..... کو اکٹھا کرنا (یعنی الگ الگ افراد یا اشیاء یا صفات کو یکجا کرنا) بلکہ لفظ " جمع " اردو میں مستعمل ہے اس لیے اس کا ترجمہ (معنی) " ..... کو جمع کرنا " بھی کر سکتے ہیں ۔ پھر یہ فعل حسی اور معنوی دونوں قسم کی چیزیں اکٹھی کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً جمَعَ مَالًا (الھمزہ : ۲) " اس نے مال اکٹھا کیا " اور فجمَع کَیۡدَہٗ (طٰہٰ : ۶۰) " اس نے اپنا مکر (ساری تدابیر کو) جمع کیا " یہ فعل متعدی ہے اور اس کا مفعول بنفسہ (بغیر کسی صلہ کے فعل کے ساتھ ہی) آتا ہے ۔ البتہ بعض دفعہ مفعول محذوف (غیر مذکور) ہوتا ہے جو سیاقِ عبارت سے سمجھا جا سکتا ہے مثلاً جمَع فاَوۡعٰی (المعارج : ۱۸) یعنی " مال اکٹھا کیا " اور ان الناس قد جمعوا لکم (آل عمران : ۱۷۳) یعنی " فوج " اکٹھی کرلی ہے ۔" اس فعل کے فاعل کو " جامع " اور مفعول کو مجموع اور جمیع بھی کہتے ہیں

● زیرِ مطالعہ لفظ (جمیع) کا وزن فعیل ہے جو اسم فاعل اور اسم مفعول — دونوں کے لیے استعمال ہو سکتا ہے (جیسے رحیم بمعنی راحم اور قتیل بمعنی مقتول ہے) اس طرح " جمیع " کے معنی حسب موقع " جامع " یا مجموع ہو سکتے ہیں یعنی اشیاء یا صفات وغیرہ کو " اکٹھا کرنے والا "۔ یا جس میں کچھ اشیاء یا صفات وغیرہ جمع کر دی گئی ہوں مثلاً " قوم جمیع " (سب کے سب لوگ) اور " رجلٌ جمیع " (بھرپور جوان آدمی) ۔

" جمیع " بلحاظ معنی " متفرق " (الگ الگ) کی ضد ہے یعنی اس لفظ میں " سب کے سب ، سارے ، سب کچھ ، پورے کا پورا ، ایک ساتھ " کا مفہوم

ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر مترجمین نے اس کا ترجمہ ان ہی لفظوں میں سے کسی ایک کے ساتھ کیا ہے۔ اور اسی مفہوم کے لحاظ سے یہ (جمیع) توکید (تاکید) کے لیے مقررہ چھ لفظوں میں سے ایک ہے اور "کُلٌّ" کے ہم معنی ہے۔ بطور تاکید استعمال ہوتے وقت اس کے ساتھ "مؤکّد" کے مطابق ایک ضمیر بھی آتی ہے۔ جیسے "قرأتُ الکتابَ جمیعَه یا کُلَّه" (میں نے ساری کتاب پڑھی)۔

قرآن کریم میں یہ لفظ (جمیع) کل چار جگہ آیا ہے اور "جمیعًا" کی شکل میں ۴۹ جگہ وارد ہوا ہے۔

۲۰ : ۱ (۸) [ثُمَّ اسْتَوٰی] "ثُمَّ" کے معنی و استعمال پر ابھی اوپر ۲ : ۲۰ : ۱ (۴) میں بات ہوئی ہے۔ اس کا ترجمہ تو یہاں "پس یا پھر" ہی کیا گیا ہے تاہم بلحاظ مفہوم ممکن ہے کہ یہ ترتیب زمانی کے لیے نہ ہو بلکہ صرف تاکید یا استیناف کا ہو۔ فعل "استوٰی" کا مادہ "س و د" اور بقول بعض "س و ی"[1] اور وزن اصلی "استفعل" ہے۔ اس کی اصل شکل "استَوَیَ" تھی جس میں آخری متحرک "یاء" (ی) ماقبل کے مفتوح ہونے کی بناء پر "الف" (مقصورہ) میں بدل جاتی ہے یعنی لکھی "ی" ہی جاتی ہے۔

اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد "سوِیَ یسوَی" کے باب اور معنی (ٹھیک ٹھاک ہو جانا) وغیرہ پر البقرہ : ۶ یعنی ۲ : ۵ : ۱ (۲) میں بات گزر چکی ہے۔

● کلمہ "استوی" اس مادہ (س و د / س و ی) سے باب استفعال کے فعل ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ اس باب سے فعل "استوی یستوی استواءً" کے معنی ہیں "ٹھیک ٹھاک ہو جانا، بھرپور جوانی میں ہونا یا پہنچنا"

---

[1] القاموس المحیط اور اقرب الموارد میں اسے واوی اللام قرار دیا ہے جب کہ المنجد اور المعجم الوسیط میں اس کو یائی اللام سمجھا گیا ہے۔ مد القاموس (Lane) میں عنوان کے طور پر دونوں مادے مذکور ہیں۔ ویسے عملاً وادی بھی یائی ہی استعمال ہوتا ہے۔

ٹھیک درمیان میں ہونا، تیار ہو جانا، سیدھا کھڑا ہونا۔" یہ فعل بنیادی طور پر لازم ہے مگر صلات کے ساتھ بطور متعدی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً "علی" کے صلہ کے ساتھ اس کے معنی ہوتے ہیں: ..... پر قابو پانا، (کرسی یا سواری) پر جم کر بیٹھ جانا" اور "الی" کے صلہ کے ساتھ (جیسے یہاں آیت زیر مطالعہ میں ہے) یا "لِ" کے ساتھ (قرآن کریم میں "لِ" کے ساتھ نہیں آیا) اس کے معنی ہوتے ہیں: "...... کا قصد کرنا، ...... کی طرف چڑھنا، ..... کی طرف توجہ کرنا"۔ عموماً یہ فعل (استوی الی ......) ایک کام ختم کرکے دوسرے کام کی طرف رخ کرنے یا اسے شروع کرنے کے لیے آتا ہے[1]۔ یہ فعل "الی" کے صلہ کے ساتھ قرآن کریم میں صرف دو جگہ آیا ہے۔

[اِلَی السَّمَآءِ] کا ابتدائی "اِلیٰ" تو فعل "استوی" کا صلہ ہے جس کے معنی ابھی اوپر بیان ہوئے ہیں۔ اور لفظ "السماء" (بمعنی آسمان) کا مادہ "س م و" اور وزن لام تعریف نکال کر "فَعَالٌ" ہے اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد "سما یسمو سُمُوًّا و سَمَاءً" (باب نصر) کے بنیادی معنی: "اونچا ہونا، بلند ہونا، چڑھنا، نکل آنا" ہیں۔ پھر یہ فعل زیادہ تر معنوی اور بعض دفعہ حسی اشیاء کی بلندی (ہمت، حسب و نسب، نظر، ہلال، شوق وغیرہ) کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ "السماء" جو ایک طرح سے مذکورہ بالا فعل کا مصدر بھی ہے اور جس کے لغوی اسم لفظی معنی "بلندی" ہیں، یہ عام طور پر "آسمان" کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی بلندی یا اونچائی کو بھی "سماء" کہتے ہیں۔ اور عربی زبان میں بادل اور بارش کو بھی "سماء" کہتے ہیں [دیکھئے البقرہ: ۱۹ یعنی <u>۲:۱۴:۱(۳)</u> میں نیز بحث "بسم اللّٰہ" میں] اس طرح "ثم استوی الی السماء" کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "پھر اس نے قصد کیا طرف آسمان کے" ــــ اور اسی کو بامحاورہ بناتے ہوئے بیشتر مترجمین نے "پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا / توجہ فرمائی" سے ترجمہ کیا ہے اور بعض نے "آسمان کی طرف

[1] دیکھئے العمدہ فی غریب القرآن (للقیسی) ص ۷۲

چڑھ گیا یا آسمان کو چڑھ گیا" بھی کیا ہے جو لفظ سے ہٹ کر ہے یا پرانی (متروک) اردو ہے۔

۲: ۲۰: ۱ (۹) [فَسَوّٰهُنَّ] یہ فَ + سَوّٰی + هُنَّ کا مرکّب ہے۔ اس میں ابتدائی "فاء" (ف) تو عاطفہ بمعنی "پس"، "پھر" ہے اور آخری ضمیر منصوب برائے جمع مؤنث غائب (هُنَّ) کا ترجمہ "ان کو" ہے۔

ان دونوں (فَ اور هُنَّ) کے درمیان فعل "سَوّٰی" ہے جس کا مادہ "س و د / س وی" اور وزن "فَعَّلَ" ہے۔ اصلی شکل "سَوَّیَ" تھی جس میں آخری متحرک "یاء" ماقبل کے مفتوح ہونے کے باعث الف (مقصورہ) میں بدل جاتی ہے یعنی لکھی "ی" ہی جاتی ہے مگر اسے پڑھا "الف" کی طرح جاتا ہے۔

اس مادہ سے فعل مجرد (سوِی یسوَی) کا ذکر ابھی اوپر "استوی" کے ضمن میں ہو چکا ہے۔

● "سَوّٰی" اس مادہ سے باب تفعیل کا فعل ماضی معروف صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ اس باب سے فعل "سَوّٰی ..... یُسَوِّیْ تَسْوِیَةً" کے معنی ہیں: .....کو برابر کر دینا، .....کو ٹھیک ٹھاک کر دینا، ..... کی ہر طرح سے تکمیل کر دینا، درست کرنا، ہموار کرنا، اور درست کر کے بنانا"۔ اس فعل (سَوّٰی یُسَوِّیْ) کے مختلف صیغے قرآن کریم میں دس سے زیادہ جگہ آئے ہیں۔

۲: ۲۰: ۱ (۱۰) [سَبْعَ سَمٰوٰتٍ] میں "سماوات" (یہ اس کا رسم معتاد ہے۔ رسم قرآنی پر "الرسم" میں بات ہوگی) تو لفظ "سماء" (آسمان) کی جمع مؤنث سالم ہے جس کی اصلی شکل تو "سماءات" تھی مگر جمع میں "سماء" کی اصل "واو" لوٹ آتی ہے (سَمَاءٌ دراصل "سَمَاوٌ" بروزن "فَعَالٌ" تھا جو الف ممدودہ کے بعد آنے کی وجہ سے "ء" میں بدل گئی تھی)

لفظ "سماء" (جو سماوات کا واحد ہے) کے مادہ وغیرہ پر ابھی اوپر

بات ہو چکی ہے۔

● پہلے لفظ " سَبْعَ " کا مادہ " س ب ع " اور وزن " فَعْلٌ " ہے۔ (" سبعَ " میں " ع " کی فتحہ کی وجہ " الاعراب " میں بیان ہوگی)۔ عربی زبان میں اس مادہ (سبع) سے فعل مجرد اور مزید فیہ کے متعدد باب مختلف معنی کے لیے استعمال ہوتے ہیں جن میں " سات " کا لفظ شامل رہتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں: " سبعَ القومَ = ... کی گنتی سات کردی "۔ " اسبَعَ القومُ = پورے سات (عدد) ہو جانا "، " سبَّعَ الاناءَ = برتن کو سات مرتبہ دھونا "۔ وغیرہ۔ تاہم قرآن حکیم میں اس مادہ سے کسی قسم کا کوئی فعل کہیں استعمال نہیں ہوا۔

● کلمہ " سَبْعٌ " کے معنی ہیں: سات۔ جو کسی مؤنث معدود (یا تمیز) کے لیے اسم عدد ہے۔ مذکر معدود کے لیے " سبعۃ " کا لفظ آتا ہے۔ قرآن کریم میں کلمہ " سبْع " مختلف صورتوں میں ۲۱ جگہ اور " سبعَۃ " ۴ جگہ آیا ہے۔ اور اسی سے ماخوذ لفظ " سبعون " (بمعنی ستر) بھی تین جگہ وارد ہوا ہے اور اسی مادہ سے ماخوذ لفظ " السبُعُ " (بمعنی درندہ جانور) بھی ایک جگہ (المائدہ : ۳) آیا ہے۔ ان پر اپنے موقع پر بات ہوگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

" سبع سماوات " کا ترجمہ بنتا ہے " سات آسمان "۔ پورے جملے میں اس کے ترجمہ کی بعض صورتوں پر " الاعراب " میں بحث ہوگی۔

۲ : ۲۰ : ۱ (۱۱) [وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ] یہ ایک پورا جملہ ہے جس کی سیدھی سادی نثر تو بنتی ہے " وَهُوَ عَلِيمٌ بِكُلِّ شَيْءٍ "۔ پھر " فاصلہ " (آیت) کی رعایت سے الفاظ میں تقدیم و تاخیر کی گئی ہے۔ جو عبارت میں شعر کا سا رنگ پیدا کرتا ہے ۔ پہلے کہیں بیان ہو چکا ہے کہ اس قسم کے ادبی اسلوب کی بناء پر ہی کفارِ مکہ قرآن کو شعر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کہتے تھے۔ حالانکہ یہ اسلوب " شعر " نہیں ہے۔ اور کفار کے سمجھدار لوگ بھی اس " الزام " کو غلط قرار دیتے تھے۔ آخر عرب کے لوگ " شعر و شاعری " کے اسالیب سے اتنے

ناواقف تو نہیں تھے۔

● مندرجہ بالا جملہ کے قریباً سب الفاظ کے معنی سے اب تک آپ واقف ہو چکے ہیں مثلاً " کلّ شیئ ٍ " کے معنیٰ (ہر چیز) اور اجزاء پر الگ الگ البقرہ : ۲۰ یعنی ۲ : ۱۵ : ۱ کے آخر پر بات ہوئی تھی۔ " دھو " (اور وہ) تو بہت ابتدائی لفظ ہیں۔ البتہ لفظ " علیم " کی مختصر وضاحت شاید ضروری ہے۔ اس لفظ (علیم) کا مادہ " ع ل م " اور وزن " فَعِیلٌ " ہے اس مادہ سے فعل مجرد (علِم یعلَم = جان لینا) کے باب اور معنی وغیرہ پر الفاتحہ : ۲ کے علاوہ البقرہ : ۱۳ یعنی ۲ : ۱۰ : ۱ (۳) میں بھی بات ہو چکی ہے۔

یہ فعل (علِم) زیادہ تر مفعول بنفسہ کے ساتھ (علِمہ) اور کبھی باء کے صلہ کے ساتھ (علِم بہ = ... کو جان لینا ... کا علم رکھنا) بھی استعمال ہوتا ہے۔

● اس طرح یہاں " علیم ب ...... " کے معنی ہیں : ...... سے خوب آگاہ، ...... کا خوب جاننے والا، خبردار، واقف "۔ " علیم " چونکہ صفت مشبہ ہے اس لیے اس میں صفتِ علم کے دوام و استمرار کا مفہوم شامل ہوتا ہے یعنی ہمیشہ اور ہر جگہ (ہر شے کو) جاننے والا۔

یوں " وھو بکل شیئ ٍ علیم " کا لفظی ترجمہ بنتا ہے : " اور وہ ہر چیز کے بارے میں خوب علم رکھنے والا ہے"۔ بعض حضرات نے اس جملہ اسمیہ کا ترجمہ جملہ فعلیہ کی طرح کر دیا ہے اس پر ہم آگے " الاعراب " میں بات کریں گے۔

(جاری ہے)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

"عکس اسرار خودی"

ڈاکٹر عصمت جاوید

علامہ اقبال کے فلسفہ خودی کے بیان میں "مثنوی اسرار خودی" کو امتیازی مقام حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے منظر عام پر آتے ہی ڈاکٹر نکلسن نے اسے انگریزی زبان کے قالب میں ڈھالنے کا عزم کیا۔ علامہ کی کسی تصنیف کا کسی بھی زبان میں یہ پہلا ترجمہ تھا۔ بعد ازاں اردو زبان میں اس کتاب کا منظوم ترجمہ کرنے کی متعدد قابل قدر کوششیں ہوئیں، انہی میں ایک گراں قدر اور کامیاب کاوش ڈاکٹر عصمت جاوید کی ہے جسے دہلی کے مرکزی مکتبہ اسلامی نے عکس اسرار خودی کے زیر عنوان کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ فکر اقبال چونکہ ہماری رائے میں اکثر و بیشتر افکار قرآنی ہی کی ترجمانی پر مشتمل ہے لہٰذا علامہ کے فارسی کلام کو اردو دان قارئین تک منتقل کرنے کے لئے اس کتاب کی قسط وار اشاعت کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

تمہید

نیست در خشک و تر بیشۂ من کوتاہی
چوبِ ہر نخل کہ منبر نشود دار کنم

نظیری نیشاپوری

مار کر شب خوں جو نکلا آفتاب
کھل اٹھے اشک مسرت سے گلاب

خواب رخصت چشم نرگس سے ہوا
میرے نغمے سن کے سبزہ جاگ اٹھا

میں لٹاتا ہوں زرِ گل بے دریغ
شعر بو کر کاٹتا ہوں فصلِ تیغ

میرے تخمِ اشک میں جوشِ نمو
میرے نالے ہیں چمن کا تار و پو

ڈالتا ہوں آفتابوں پر کمند
لاکھ صبحیں ہیں مری مٹھی میں بند

خاک میری جامِ جم سے پختہ تر
رازِ دو عالم کی رکھتی ہے خبر

ایسے آہو ہیں مرے فتراک میں
جو ہیں ناپیدا لباسِ خاک میں

سبزۂ نارُستہ گلشن میں مرے
ہیں گل اندر شاخ دامن میں مرے

کرکے برہم محفلِ باغ و بہار
میں نے چھیڑا ہے رگِ عالم کا تار

سازِ فطرت ہے مرا نادر نوا
دوست نغموں سے مرے ناآشنا

اس جہاں میں مہرِ نوزائیدہ ہوں
رسم و آئینِ فلک نادیدہ ہوں

رم کریں انجم، کہاں مجھ میں وہ آب
ہے مری فطرت ابھی کم اضطراب

میں ابھی تک بحر پر آیا نہیں
بن کے لالی کوہ پر چھایا نہیں

پھر وہ کیا جانے مرا رقصِ ضیا،
پھر یہ کیا سمجھے مرا رنگِ حِنا

مجھ سے نامانوس، چشمِ ہست و بود
کانپ اٹھتا ہوں، وہ ہے خوفِ نمود

شبنمِ نو ہوں، برافگندہ نقاب
صبح دم نکلا ہوں مثلِ آفتاب

صبح خیزوں کا ہے مجھ کو انتظار
آگ ہوں! آتش پرستوں کو پکار

نغمہ ہوں، پر بے نیازِ ساز ہوں
شاعرِ فردا کی میں آواز ہوں

مثلِ یوسف کیا بکوں بازار میں
ہے زمانہ میرا اندھے غار میں

اور تہی داماں ہیں یارانِ قدیم
طور میرا آج بھی مانگے کلیم

میرے یاروں کا ہے دریا بے خروش
اور مرے قطروں میں ہے دریا کا جوش

دوسرا ہے میرے نغموں کا جہاں
یہ جرس اس کارواں کا ہے کہاں؟

کتنے شاعر مر کے زندہ ہو گئے
نیند سے ہم کو جگا کر سو گئے

مر کے وہ زندوں میں پھر سے آملے
پھول بن کر اپنی قبروں پر کھلے

ان کے کتنے کارواں گزرے خموش
جیسے اونٹوں کا خرامِ بے خروش

میں ہوں عاشق، نالہ ہے عادت مری
شورش و ہنگامہ ہے فطرت مری

میں وہ نغمہ، جو نہ سنبھلے ساز سے
ساز بھی ٹوٹے مری آواز سے

دور میرے زورِ طوفاں سے رہے
کہہ دو قطرے سے کہ دریا میں بہے

کیا سنبھالے زورِ بے پایاں مرا
بحر کے بس کا نہیں طوفاں مرا

جو کلی کھلتی نہ ہو گلزار وار
اُس پہ کیا ریجھے مرا ابرِ بہار

بجلیاں خوابیدہ میرے دل میں ہیں
کتنے طوفاں میرے آب و گل میں ہیں

دشت تو، میں سیل اے میرا سلام
طور بن کر بڑھ، مری بجلی کو تھام

ہوں ازل سے محرم تابِ حیات
مجھ کو قدرت سے ملا آبِ حیات

میرا نغمہ سن کے، ذرّہ جی اٹھے
بن کے جگنو ہر طرف اُڑنے لگے

اس جہانِ راز میں میرے سوا
فاشِ رازِ زندگی کس نے کیا؟

سِرِّ عیشِ جاوداں، آ مجھ سے سیکھ
دین و دنیا ساتھ پانا، مجھ سے سیکھ

بند میں رکھوں لبِ اعجاز کیا
کوئی اپنوں سے چھپائے راز کیا

ساقی دلبر مجھے وہ جام دے
غم بھلا کر جو مجھے آرام دے

آبِ زمزم سے بنی ہو یہ شراب
جس کے آگے جامِ جم ہو آب آب

جس کو پی کر تیز تر ہو فکرِ تیز
دیدۂ بیدار ہو عشرت گریز

کاہ کو جو کوہِ با عظمت کرے
بزدلوں میں شیر کی طاقت بھرے

خاک کو جو رفعتِ افلاک دے
ذہن کو اندیشۂ بے باک دے

جس سے قطرے کو ملے دریا کا جوش
ذرّۂ ناچیز ہو صحرا بدوش

جس سے خاموشی میں ہو محشر کا شور
جس کو پی کر باز پر جھپٹے چکور

ہاں اے ساقی وہ شرابِ ناب دے
جو شبِ اندیشہ کو مہتاب دے

میں کروں بھٹکے ہوؤں کی رہبری
دوں غلاموں کو میں ذوقِ سروری

جستجوئے نو کی میں دُھن میں چلوں
آرزوئے نو کی گرمی سے جلوں

چشمِ اہلِ ذوق کی پُتلی بنوں
گوشِ عالم میں صدا بن کر رہوں

روتی آنکھوں کو گُلِ لالہ کروں
قیمتِ جنسِ سخن بالا کروں

کھول دوں پھر لے کے نامِ پیرِ روم
دفترِ سربستۂ رازِ علوم

جانِ رومی میں دہکتے شعلہ زار
ہیں، فروغِ یک نفَس، مثلِ شرار

شمعِ سوزاں آئی جب خود چل کے پاس
گم ہوئے پروانے کے ہوش و حواس

فیضِ پیرِ روم سے اکسیر ہے — خاک میں میری نم تعمیر ہے
میں کہ ذرّہ جب زمیں سے اڑ گیا — اپنے سورج سے بالآخر جڑ گیا
بحرِ رومی میں ہوں مثلِ موج' میں — گوہرِ نایاب جس کی تہہ میں ہیں

اس کے ساغر ہی سے پیتا ہے غلام
لے کے اس کی سانس جیتا ہے غلام

شب' مرا دل مائلِ فریاد تھا — نعرۂ "یارب" مجھے بس یاد تھا
شاکیٔ دوراں میں ہوتا تھا کبھی — خالی پیمانوں پہ روتا تھا کبھی
اِن خیالوں میں الجھ کر کھو گیا — پھر میں سوتے سوتے آخر سو گیا
خواب میں دیکھا کہ پیرِ معنوی — راقمِ قرآں بحرفِ پہلوی
کہہ رہا ہے مجھ سے اے بیتابِ عشق — کیوں نہیں پیتا شرابِ نابِ عشق؟
دل میں محشر کر بپا دیوانہ وار — نشتر آنکھوں پر تو سر شیشے پہ مار
قہقہوں کو شورشِ جیحوں بنا — پھر جگر پاروں کو اشکِ خوں بنا
کیوں ہے چپ' منہ بند کلیوں کی مثال — عام کر دے، مثلِ گل' بوئے کمال
ہے سپندِ دل ترا ہنگامہ وار — آگ سے ہوتا نہیں کیوں ہمکنار
تو جرس ہے اپنا سرمایہ اچھال — نالۂ خاموش کو باہر نکال
آگ سے تیری ہو روشن یہ جہاں — عام کر دے اپنا تو سوزِ نہاں
فاش کر اسرارِ پیرِ مے فروش — جام میں اپنے سما جا بن کے جوش
فکر کے شیشے کی کیسی دیکھ بھال! — لا کے چورا ہے پہ اُس کو توڑ ڈال
دے نیستاں کی خبر تو مثلِ نے — کچھ تو لیلیٰ کی سنا تو قیس ہے!
طرزِ نالہ اک نئی ایجاد کر — ہائے و ہو سے بزم کو آباد کر
بن کے جانِ نو' ہر اک جاں میں سما — کہہ کے "قم" زندوں کو زندہ تر بنا
جادۂ نو کی طرف رخ موڑ دے — طرزِ رفتارِ کہن کو چھوڑ دے
چپ نہ رہ' رازِ دروں اب سب پہ کھول — تو درائے کارواں ہے' کچھ تو بول!

سن کے یہ، بھڑکی مری رگ رگ میں آگ   مثلِ نے، ڈھلنے لگے سینے میں راگ
بن کے نغمہ جب میں پھوٹا ساز سے   دم بخود سب تھے مری آواز سے

لے کے اپنے ہاتھ میں سازِ خودی
میں سنانے لگ گیا رازِ خودی

نقشِ ہستی میرا اک خاکہ سا تھا   ناقص و بے کار و ناکارہ سا تھا
جب تراشا عشق نے، آدم بنا   عالمِ کیف و کم عالم بنا
نبضِ گردوں کی سنی ہے گفتگو   چاند کی رگ رگ میں دیکھا ہے لہو
کتنا رویا ہوں میں انساں کے لیے   رازِ ہستی تب کہیں مجھ پر کھلے
میں نے دیکھی کارگاہِ ممکنات   میں نے کھولا سِرِّ تقویمِ حیات
چاند اگرچہ ہوں اندھیری رات کا   ملتِ بیضا کا ہوں میں گردِ پا
ملتِ بیضا ہے مشہورِ جہاں   جس کے نغموں سے جہاں آتش بجاں
جس کے خرمن میں ہیں دانوں کی مثال   رومی و عطار جیسے باکمال
میں نکالوں آگ اپنے راگ سے   ہوں دھواں، لیکن ہے نسبت آگ سے
فیضِ فکرِ تیز سے میرا قلم   رازِ ہستی کھولتا ہے دمبدم

تاکہ قطرہ ہمسرِ دریا بنے :
ذرہ پھیلے، پھیل کر صحرا بنے !

میں نے کی منظوم جو یہ مثنوی   اس سے کب مقصد ہے میرا شاعری
دیکھ اس میں صرف جوشِ اندروں   بت پرستی، بت گری میں کیوں کروں
فارسی بولی سے میں بیگانہ ہوں   مثلِ ماہِ نو، تہی پیمانہ ہوں
حسنِ اندازِ بیاں، مجھ میں نہ ڈھونڈ   خوانسار و اصفہاں، مجھ میں نہ ڈھونڈ
یوں تو ہندی بھی ہے پیاری پارسی   اس سے پیاری ہے زبان فارسی

فارسی میں فکر میری شعلہ دم — اس میں نخلِ طور ہے میرا قلم
رفعت اندیشہ کی فطرت شناس — یہ زبانِ دل مجھے آئی ہے راس

گر ہے پیمانہ، رنگِ مینا سے گزر
بادۂ مینا پہ رکھ اپنی نظر

بقیہ : حرفِ اوّل

میں ان دو مقامات پر مسلسل درس جاری تھا۔ (بعد میں مسجد خضریٰ کا درس مسجد دارُالسّلام میں منتقل ہو گیا۔) لیکن افسوس کہ اتوار کی صبح کی نشست کے ختم ہو جانے کے باعث اس مسلسل درس کا سلسلہ بہت سست رفتاری سے آگے بڑھ سکا۔ چنانچہ ان سطور کی تحریر کے وقت تک (یعنی فروری ۱۹۸۹ء تک) یہ درس اٹھائیسویں پارے کے اختتام تک پہنچ سکا ہے۔"

اس سلسلہ وار درس قرآن حکیم کی تکمیل ہفتہ ۹ر نومبر کو قرآن آڈیٹوریم میں ہوئی۔ اس اہم موقع پر مرکزی انجمن کی جانب سے ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں بعض اہل علم و دانش کو عظمتِ قرآن حکیم اور اہمیتِ درس قرآن کے موضوع پر خطاب کی دعوت دی گئی تھی۔ اظہارِ خیال کرنیوالوں میں جناب خرم جاہ مراد' ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی' ڈاکٹر خالد علوی' پروفیسر حافظ احمد یار' حافظ نذر احمد اور مولانا عبدالرحمٰن اشرفی شامل تھے۔ اس باوقار اور تعداد سامعین کے اعتبار سے پُر رونق تقریب کی قدرے مفصل روداد "ندا" کے ۳۰ر نومبر کے شمارے میں شامل ہے۔ تاہم ہمارے اعتبار سے اہم تر بات یہ ہے کہ تکمیلِ درس قرآن کی یہ تقریب سلسلہ وار درس قرآن کے دوسرے دَور کی تمہید ثابت ہوئی۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے اعلان کیا کہ آئندہ ہفتے یعنی ۱۶ر نومبر سے اسی قرآن آڈیٹوریم میں سلسلہ وار درس قرآن کا از سرِ نو آغاز کر دیا جائے گا۔ آئندہ یہ درس ہفتے میں ایک بار نہیں دو بار ہو گا یعنی ہفتہ و اتوار۔ مزید یہ کہ تمہید کے طور پر پہلے دو خطابات "تعارف قرآن" کے موضوع پر ہوں گے۔ (اس ضمن میں جو ہینڈ بل' ماڈل ٹاؤن اور گارڈن ٹاؤن میں تقسیم کیا گیا اس کا عکس زیر نظر شمارے کے صفحہ ۳۴ پر طبع کر دیا گیا ہے)۔ اللہ سے دعا ہے کہ اس مبارک سلسلے کو شرف قبول عطا فرمائے اور قرآن حکیم کے چشمہ ہدایت سے استفادے کا یہ سلسلہ تادیر باقی رہے۔

XXX

قرآن کالج میں اساتذہ کے لیے
ریفریشر کورس کا انعقاد

رپورٹ: میاں ساجد حمید

علم الیقین کی حد تک تو سب کہتے اور ہم بھی مانتے رہے ہیں کہ حدیث نبویؐ کے مطابق گود سے گور تک علم حاصل کرنا چاہئے، لیکن ۱۲ر اکتوبر سے ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۱ء تک جب قرآن کالج کے پروفیسروں کو اپنے شاگردوں کے ڈیسکوں پر بیٹھ کر لیکچر سنتے دیکھا' تو یہ حقیقت عین الیقین بن گئی۔

قرآن اکیڈمی و قرآن کالج میری مادرِ علمی ہیں۔ میں تجدیدِ ارادت کے لئے یہاں حاضری دیتا رہتا ہوں۔ ایک دفعہ میرے استاد پروفیسر منور ابن صادق جو پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ تعلیم و تحقیق سے وابستہ ہیں اپنے دو بیٹوں کے قرآن کالج میں داخلے کے سلسلے میں میرے ہمراہ ناظم قرآن کالج لطف الرحمٰن خان صاحب سے ملے تو لطف الرحمٰن خان صاحب نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ قرآن کالج کے اساتذہ کے لئے فنِ تدریس کے حوالے سے مختصر ریفریشر کورس کے خواہاں ہیں۔ پروفیسر صاحب نے اس خواہش کا خیر مقدم کرتے ہوئے بتایا کہ وہ تو سکولوں' کالجوں' اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے لئے مختصر کورسوں کے انعقاد کو پہلے سے اپنے پروگرام میں شامل کئے ہوئے ہیں۔

یہ بات کہیں جون جولائی میں ہوئی تھی لیکن اس کے بعد پروفیسر منور ابن صادق صاحب الحرکۃ الاسلامیہ پاکستان کے زیر اہتمام مطالعۂ اسلام کورس اول میں مسلسل ایسے مصروف ہوئے کہ وسطِ اکتوبر تک کالج کے لئے وقت فارغ نہ کر سکے۔ ۵ر اکتوبر کو انہوں نے کالج کے لئے مجھ سے رابطہ کیا اور ناظم کالج سے مشورے کے بعد کالج کے اساتذہ کے لئے ایک ہفتے کا کورس طے پا گیا۔ اس کورس میں درج ذیل عنوانات پر لیکچرز شامل کئے گئے: تعلیم کی فلسفیانہ بنیادیں' تعلیم کی نفسیاتی بنیادیں' طریقہ ہائے

تدریس بحوالہ خصوصی اردو' عربی' اسلامیات و علوم عمرانی اور ضبطِ طلبہ۔ پروفیسر منور ابن صادق نے اپنے روایتی انکسار کے پیش نظر اور قرآن کالج کے اساتذہ کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس پروگرام کو ریفریشر کورس کی بجائے "تبادلۂ خیالات" کا نام دیا

تبادلۂ خیالات کی نشستیں دوپہر دو' سوا دو بجے سے لے کر نماز عصر کے وقفے کے ساتھ' تقریباً مغرب تک (یعنی چھ بجے شام تک) جاری رہتی تھیں۔ آغاز لیکچر سے ہوتا تھا' نماز عصر کے بعد چائے پر سامعین کے سوالات کے حوالے سے تبالۂ خیالات ہوتا۔

ان نشستوں میں پروفیسر منور ابن صادق صاحب کے علاوہ ادارہ تعلیم و تحقیق کے دو فاضل پرفیسروں ڈاکٹر محمد شفیع مرزا اور پروفیسر چوہدری علی احمد صاحب نے بھی لیکچر دئے۔ ناظم قرآن کالج اسلامک ایجوکیشنل ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کے سیکرٹری ملک اشفاق حسین اور راقم الحروف کے علاوہ قرآن کالج کے درج ذیل اساتذہ نے کورس میں شرکت کی۔

۱۔ حافظ نذیر احمد صاحب ۵۔ حافظ محمد ابراہیم صاحب
۲۔ مولانا عصمت اللہ صاحب ۶۔ جناب شہزاد سردار صاحب
۳۔ جناب عطاء الرحمٰن ثاقب صاحب ۷۔ حافظ خالد محمود خضر
۴۔ حافظ غلام شبیر صاحب

کورس کا ماحصل یہ تھا کہ تمام تر علمی مہارت کے باوجود معلم کے لئے فن ابلاغ میں تربیت بڑی ضروری ہے۔ اس سلسلے میں اسے فلسفہ تعلیم اور نفسیات تعلیم کا ضروری علم ہونا چاہئے اور ان کی بنیاد پر تعین مقاصد' تشکیل نصاب' حکمت تدریس اور انتظامیات کی مختلف صورتوں سے واقفیت ہونی چاہئے۔ کورس کے شرکاء نے تبادلہ خیالات کے اس مختصر پروگرام کی افادیت کا اعتراف کیا اور اس میں اسلامی تناظر کو نمایاں کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ پروفیسر منور ابن صادق نے جواباً فرمایا کہ ہم نے یہاں قرآن کالج میں فلسفہ تعلیم کے اسلامی تناظر کو نمایاں کرنا اس لئے ضروری نہیں سمجھا کہ اس حوالے سے ہم یہاں کے اساتذہ کو خود کفیل سمجھتے ہیں' ورنہ عام سکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے لئے ہمارے کورسز کا مطمع نظر ہی اسلامی تناظر ہے۔ بہر حال یہ ہماری آپ کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ اس موقع پر انہوں نے اعلان کیا کہ وہ جلد درس نظامی کے فارغین اور السنہ شرقیہ کے فاضلین کے

باقی صفحہ ۳۳ پر

ڈاکٹر حافظ محمد مقصود

"اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے"

(گزشتہ سے پیوستہ)

۲- یہ ایک علمی تحریک نہیں ہے۔ اس ضمن میں اس حقیقت کا اظہار و استحضار ضروری ہے کہ دورِ خلفائے راشدین کے بعد اگرچہ بحیثیتِ مجموعی امّتِ مسلمہ کے رویّے میں تبدیلی شروع ہو گئی تھی، مگر پھر بھی یہ اشخاص و افراد کی تبدیلی تھی، کانسٹی ٹیوشن کی تبدیلی نہ تھی ـــ دستور و آئین اور حدود و تعزیرات قرآن و سنّت ہی کے نافذ تھے۔ کسی نے خدا اور رسولؐ کے قانون کو چیلنج نہیں کیا تھا، کسی نے جنّت و دوزخ کے تصوّر کا مذاق نہیں اُڑایا تھا، کسی نے قیامت کے ظہور و بروز کے نظریے پر پھبتیاں نہیں کسی تھیں۔ دراصل مسلمانوں کے اندر سستی، کاہلی اور بے عملی کے جراثیم در آئے تھے، لٰہذا اس کمی کو دُور کرنے کے لیے ایک اصلاحی یا تبلیغی قسم کی تحریک لازمی اور لابدی تھی۔

مگر آج سے ڈھائی تین سو سال پہلے جب مغربی استعماریت اور شہنشاہیت (WESTERN IMPERIALISM) نے عالمِ اسلام پر اپنے آہنی پنجے گاڑنے شروع کر دیئے اور بالآخر پورے عالمِ اسلام کو نہ صرف اپنے ہوس و حرص کے پنجۂ خونیں میں گھیر لیا، بلکہ فکر و فلسفہ کے ایک نئے اور لادینی عفریت کے ساتھ خدا اور رسولؐ، جنّت و دوزخ، فرشتہ و وحی اور قیامت و آخرت جیسے تصورات کو علی الاعلان چیلنج کیا۔ چنانچہ ایسی سنگین صورتِ حال میں محض ایک اصلاحی اور تبلیغی قسم کی کوشش کافی نہیں رہی، بلکہ شدید ترین ضرورت اس امر کی پیدا ہو گئی کہ خود مسلمانوں کے اندر ذہانت و فطانت کی دولت سے مالا مال ایسے نوجوان اُٹھیں جو اس لادینی فکر و فلسفہ کے بُت کی دھجیاں بکھیر سکیں۔ ہاں وہی خدا ناشناس اور آدم فریب فکر و فلسفہ جس نے عرب سے لے کر عجم اور مشرق سے لے کر مغرب تک بحیثیتِ مجموعی پوری نوع

انسانی کے دماغوں سے اللہ تعالیٰ کے تصوّر کو اُچک کر نہ صرف انسان کو انسان کا خونخوار شکاری بنایا بلکہ دنیا کے اس گلستان کو شر و فساد، ذلت و رسوائی، درندگی و خونخواری اور ناصبوری و ناشکیبائی کا ماتم کدہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سائنسی علوم اور فکر و فلسفہ نے نہایت تیزی سے ترقی کرتے کرتے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ ایک فوق الطبیعی اللہ تعالیٰ کے تصوّر یا عشقِ خداوندی کو سائنسی علوم سے نکال کر اس فکرِ گستاخ نے فطرت کی طاقتوں کو اپنے خلاف عُریاں کر کے اُن بے تاب بجلیوں کے سامنے اپنے ہی آشیانے کو جس بے دردی، بے عقلی اور ناسمجھی سے داؤ پر لگا دیا ہے اس کی حقیقت اور واقعیت کو آج صرف ایک مادرزاد اندھا ہی جھٹلا سکتا ہے۔ سائنسی علوم و فنون نے ایک پہلو سے انسانیت کی خدمت بھی کی ہے مگر اس خدمت کا جو بھاری معاوضہ اس نے چیختی ہوئی ماؤں، لُٹی ہوئی بہنوں، پھٹتے ہوئے بارودی ذخیروں سے نکلتے ہوئے دُھوؤں، قلبی، ذہنی اور دماغی عارضوں، بموں اور میزائلوں کے جا بجا پھیلے ہوئے انباروں، توپوں، ٹینکوں اور بندوقوں سے نکلتی ہوئی قہر آلود اور زہر آلود گولیوں کی باڑوں اور گلی کوچوں اور سڑکوں اور شاہراہوں پر گھسٹتی ہوئی بدقسمت اور اعضا بُریدہ انسانی لاشوں کی شکل میں وصول کیا ہے اُس سے زندگی کے ہر موڑ پر ہمیں سابقہ پڑ رہا ہے۔

اقبال اپنے فارسی کلام میں علم (سائنس) اور عشقِ خدا کے مابین ایک مکالمہ پیش کرتا ہے جس میں علم (سائنس) نہایت فخر و استکبار سے دعویٰ کرتی ہے کہ :

نگاہم رازدارِ ہفت و چار است — گرفتارِ کمندم روزگار است
جہاں بینم بایں سُو باز کردند — مرا با آنسوئے گردوں چہ کار است
چکد صد نغمہ از سازے کہ دارم — بباز ار افگنم رازے کہ دارم

ترجمہ : میری نظر اس وسیع و عریض کائنات کی راز دار ہے اور زمانہ میری کمند میں گرفتار ہونے کی وجہ سے میرا تابع و محکوم ہے۔ میری آنکھوں کا کام کائنات کی اُن اشیا کے ساتھ ہے جو مشاہدہ (حواس خمسہ) میں آسکتی ہوں اور مجھے اس علمِ حواس سے

پرے اور آسمان سے اوپر کی چیزوں (مثلاً خدا، جنت، دوزخ، ملائکہ وغیرہ) سے کوئی سروکار نہیں۔ میرے ساز سے سینکڑوں نغمے بلند ہوتے ہیں اور کسی راز کو ظاہر آشکار کرنے کے بعد اسے سرِ بازار لوگوں کے سامنے لے آتی ہوں تاکہ ہر فردِ نوعِ بشر اس سے مستفیض ہو سکے۔

علمِ سائنس کے یہ بلند بانگ دعوے سُن کر عشقِ خداوندی جواب دیتا ہے کہ ؎

زافسونِ تو دریا شعلہ زاراست ۔۔۔ ہوا آتش گذار و زہر داراست
چو بامن یار بودی نور بودی ۔۔۔ بُریدی از من و نورِ تو ناراست
بہ خلوت خانۂ لاہوت زادی ۔۔۔ ولیکن در نخِ شیطاں فتادی
بیا ایں خاکداں را گلستاں ساز ۔۔۔ نہ گردوں بہشتِ جاوداں ساز

اے علمِ سائنس تیری ستم ظریفی اور فتنہ سامانی سے تو دریا بارودی دھماکوں، آتش گیر مادوں، بموں اور میزائلوں کے زیرِ اثر زہریلے اور انسانیت دُشمن شعلہ زار بنے ہوئے ہیں۔ اور پوری فضائے بسیط ایک زہریلا گولہ اور آتشیں گذرگاہ بنی ہوئی ہے۔ جب تک تیری (سائنس) دوستی میرے ساتھ رہی تو ایک بارانِ رحمت اور نورِ نایاب بن کر اپنی باخدا روشنی سے سسکتی ہوئی انسانیت کی شبِ تاریک کو برابر چیرتی پھاڑتی اور روشن کرتی رہی۔ مگر مجھ (تصوّرِ خدا) سے جُدا ہونا ہی تھا کہ تُو (سائنس) ایک غیر ذمہ دار اور شُترِ بے مہار کی شکل اختیار کرکے پوری نوعِ انسانی کے حق میں رحمت کے بجائے زحمت اور نُور (روشنی) کی جگہ نار (آگ و آتش و خورشید) بن گئی۔ (اے سائنس تجھے کچھ یاد بھی ہے کہ) جن لوگوں (مسلمانوں) نے تجھ کو باقاعدہ (قرآنِ حکیم کے ارشادات اور محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیماتِ حکمت کی روشنی میں) مدوّن اور مرتّب کیا اُن کا دماغ میرے (عشقِ خدا) نُور سے منوّر اور اُن کا دل میرے سوز سے معمور تھا۔ لیکن بعد میں ایک لادینی اور بے خدا ذہنیت رکھنے والی نوعِ انسانی کے ہاتھ آکر تو (سائنس) بُری طرح شیطانِ لعین کے جال میں پھنس گئی۔ اے سائنس آ کہ دونوں (تصورِ خدا + سائنس) مل کر اس کُرّۂ ارضی کو گلستان اور باغ و بہار بنائیں اور آسمان کے نیچے بہشتِ

جاوداں کی بنا ڈالیں!!

پس ایک ایسا فکر و فلسفہ جس نے ایک طویل تخریبی عمل کے ذریعے انسانی عقلوں کو ٹیڑھا اور فطرتوں کو بُری طرح مسخ کر دیا ہے، اس کے طلسم کو توڑنے اور اثرِ بد کو روکنے کے لیے ایک عظیم الشان اور زبردست علمی تحریک کی ضرورت ہے۔ اگر عجم کے لالہ زاروں سے ایسی علمی تحریک نہ اُٹھی تو وہ دن دُور نہیں جب یہ بے خدا اور خونخوار فکر و فلسفہ نہایت سنگدلی کے ساتھ اپنی آتشِ تیز سے نوعِ انسانی کو خاکستر کر کے رکھ دے گا۔

چنانچہ آج ایک اشد ضرورت اس امر کی پیدا ہو گئی ہے کہ ہم جرسِ کارواں سے بیدار اور گرد و پیش سے خبردار ہو کر اعلیٰ ترین علمی سطح پر ایسے اداروں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں لائیں، جن میں نسلِ جدید کے نوجوانوں کو تعلیم دے کر ان کے باطن میں ایمان و یقین، فکر و نظر اور عقل و دانش کا ایک ایسا مضبوط محور (STRONG AXIS) نصب کر دیا جائے کہ پھر نسلِ جدید کے یہی افراد فلسفی، مفکر، اور اسکالرز بن کر مشرق و مغرب کے پوری لٹریچر مثلاً علومِ عقلی، جیسے منطق، اخلاقیات، نفسیات، الٰہیات، مابعد الطبیعیات، علومِ طبیعی جیسے کیمیا، ریاضی، طبیعیات، فلکیات، اور علومِ عمرانی جیسے قانون، معاشیات اور سیاسیات پر ایک تنقیدی نظر دوڑائیں۔ وہ ع "قرآں میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں!" کے مصداق قرآن کے اسرار و رموز اور فکر و فلسفہ کے ذریعے عقل و خرد کی ساری گتھیاں سُلجھا کر ع "یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی" اور ع "یقیں اللہ مستی، خود گزینی" کی مانند صاحبِ جنوں اور ے "عقل کو تنقید سے فرصت نہیں۔ عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ" کے مظہرِ اتم بن کر اُس پیرِ رومی کی قیادت میں اُسی قافلۂ شوق کے سپاہی بن جائیں جس میں شمولیت کو اقبال بھی اپنے لیے باعثِ فخر و ناز سمجھتا ہے، تاکہ پھر یہ قافلہ نگاہ و سپاہ کی تیغ بازی سے توہمات میں اُلجھے بغیر دل و جود کو چیر کر طلسمِ عصرِ حاضر کے لیے توڑ، زمانہ کے زہرِ ہلاہل کے لیے تریاق اور ذہنی و فکری ارتداد اور خودکشی کے

سمِ قاتل کے لیے آبِ حیات کا کام دے سکے۔

یہی خدا پرست نسل دورِ جدید کی محدود اور کوتاہ بین علمیّت اور عقلیت کی پیدا کردہ محدودیتِ نگاہ کے سنگِ گراں کو توڑ کر کائنات کی تحقیق و تجسّس کے ذریعے اَنائے لامحدود اور بقائے خودی کا وہ نظریہ اور فلسفہ اعلیٰ ترین دماغوں میں دلیل و برہان کی قوت سے بٹھا سکتی ہے جس فکر و نظریہ کی عدم موجودگی نے انسان کو غمِ مرگ کا زندانی اور طلسمِ دوش و فردا کا اسیر بنا رکھا ہے، اور یہی توضیح و تفہیم کی اعلیٰ ترین سطح پر ملکِ لازوال اور حیاتِ انسانی کے دوام و تسلسل کا اطمینان دلا کر سرکش دماغِ انسانی کو ع "عقل غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب" کا پروانہ بنا کر حیاتِ دنیوی کی تنگ دامانی اور آخرت کی حیاتِ جاودانی کا رازدار بنا سکتی ہے۔

شُخمِ گُل کی آنکھ زیرِ خاک بھی بے خواب ہے
کس قدر نشو و نما کے واسطے بے تاب ہے
زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے
خود نمائی، خود فزائی کے لیے مجبور ہے
سردیٔ مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں
خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں
پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ
ہے لحد اس قوتِ آشفتہ کی شیرازہ بند
ڈالتی ہے گردنِ گردوں میں جو اپنی کمند
موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے،
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے!

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات

ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اَجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں
آہ غافل! موت کا رازِ نہاں کچھ اور ہے!
نقش کی ناپائداری سے عیاں کچھ اور ہے!

پستیٔ عالم میں ملنے کو جُدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فُرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم
مرنے والے مرتے ہیں، لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جُدا ہوتے نہیں

جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں،
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے، فنا ہوتا نہیں

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدّر ہو یہ وہ گوہر نہیں

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

قلزمِ ہستی سے تُو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اِس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

تُو اِسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

(جاری ہے)

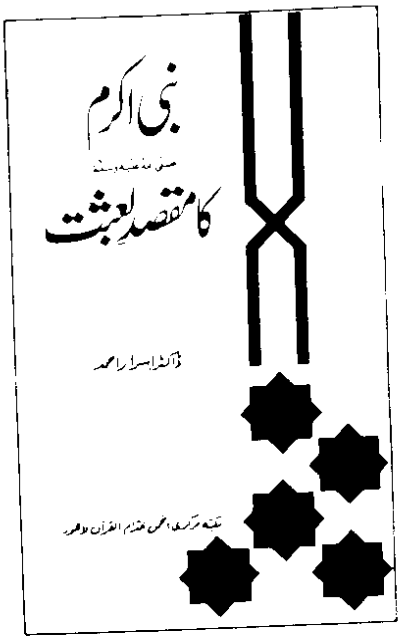

اشاعتِ خاص -/۲۰ روپے، عام -/۱۰ روپے

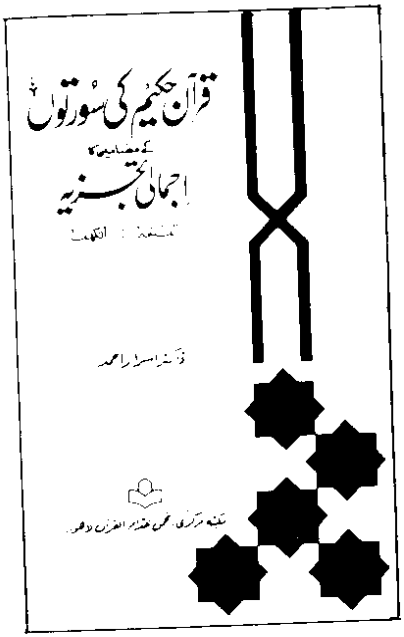

اشاعتِ خاص -/۴۰ روپے، عام -/۲۰ روپے

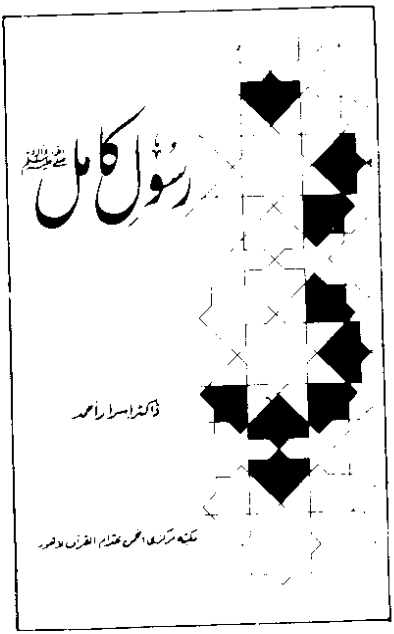

اشاعتِ خاص -/۱۶ روپے، عام -/۷ روپے

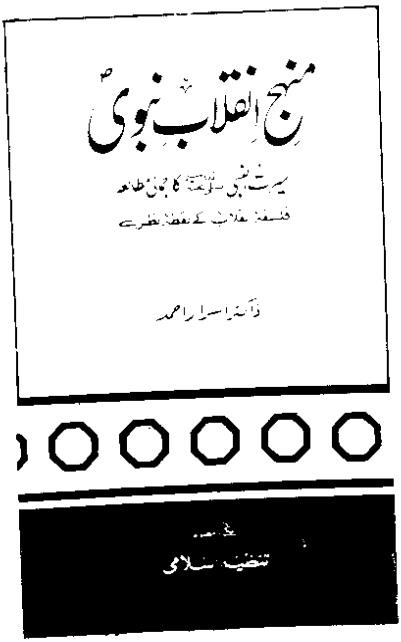

اشاعتِ خاص -/۶۰ روپے، عام -/۳۰ روپے

NOV 1991 Regd No. L. No. 8193

MONTHLY
HIKMAT_E_QURAN
LAHORE

VOL.10
NO. 11

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ——— اور ——— سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے پر ——— اور ——— اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ——— اور ——— غلبۂ دینِ حق کے دور ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ